اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۰۹)

اِقبال ریویو

خصوصی پیشکش

انتخاب نمبر

(اقبال ریویو کے سابقہ شماروں سے انتخاب)

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان

(اپریل ۲۰۰۹ء)

اقبال ریویو

خصوصی پیشکش

انتخاب نمبر

(اقبال ریویو کے سابقہ شماروں سے انتخاب)

جلد (۱۸) شمارہ (۱)

ISBN No: 81-86370-43-9

اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد، انڈیا

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد

(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر

(نائب صدر اکیڈیمی)

۲۔ سید امتیاز الدین

(معتمد اکیڈیمی وایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۵۰ روپے

ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۹۰ روپے

بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ ۔حیدرآباد۔500028

آندھرا پردیش (انڈیا)۔فون:66663950

e-mail:ihfiqbal@hotmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ : محمد کلیم محی الدین، افضال الحق ندوی ''شارپ کمپیوٹر'' H.NO 16-8-907/A،

نیو ملک پیٹ، قریب ریلوے اسٹیشن، حیدرآباد 500024۔فون:9392427796

سید امتیاز الدین ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے وی جی پرنٹرز دلسکھ نگر، حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

	اقبال ریویو کا سفر	اداریہ	۵

انتخاب مضامین

۱	اگر خواہی حیات اندر خطر زی	محترم سید خلیل اللہ حسینی بانی و سابق صدر اقبال اکیڈیمی و مجلس تعمیر ملت	۹
۲	صبح مراد۔ اردو نثر کا اقبال	پروفیسر غلام دستگیر رشید سابق صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی	۱۸
۳	قرآن اور اقبال	پروفیسر صلاح الدین سابق صدر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی	۲۵
۴	جاوید نامہ۔ فکری پس منظر	پروفیسر عالم خوندمیری سابق صدر شعبۂ فلسفہ، عثمانیہ یونیورسٹی	۳۶
۵	مسجد قرطبہ۔ ایک تجزیاتی تحسین	پروفیسر سید سراج الدین سابق صدر شعبہ انگریزی و پرنسپل پوسٹ گرائجویشن کالج، عثمانیہ یونیورسٹی	۵۲

○

	ادارہ	۶۱

☆☆☆

اقبالؔ شناسی کیوں؟

فِکر کے شاعرانہ اظہار اور اس کی بے پناہ اثر انگیزی نے مطالعۂ اقبالؔ کو عصر جدید کی ایک ایسی ضرورت بنا دیا ہے جس سے صرفِ نظر ممکن نہیں ..... یہ مطالعہ اس لئے بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اقبالؔ کے واسطے سے اِس دَور کی مضطرب اور ناآسودہ اِنسانیت کے مسائل کا نہ صرف واضح عرفان ہو سکتا ہے بلکہ اس کی علمی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ معنوی اور نظریاتی سمت بھی متعین ہوتی ہے۔

اقبالؔ کی فکر میں جو توانائی ہے وہ اسلام کی عطا کردہ ہے، اسی اعتبار سے انہوں نے ساری انسانیت کے مسائل کو اپنی فکر کا محور بنایا اور مختلف، متضاد نقاطِ نظر کے درمیان تطبیق کی وہ راہ نکالی، جہاں اُن کا پیام، انسانیت کی ضرورتوں کی تکمیل نہ صرف ارضی سطح پر کرتا ہے بلکہ اس کے ڈانڈے روحانی اور وجدانی سرچشموں سے مل جاتے ہیں۔ اسی لیے دورِ جدید میں اقبالؔ شناسی، اقبال مندی کی علامت بن گئی ہے۔

☆☆☆

اداریہ

اقبال ریویو کا سفر

ایک ایسا ادبی اور علمی رسالہ جو اپنے ہر شمارے میں تحقیقی اور تجزیاتی مواد شائع کرنے کی روایت برقرار رکھے ہوئے ہے، اس کا تجارتی اعتبار سے کامیاب ہونا خارج از بحث ہے۔ ریویو کی اشاعت محدود ہے۔ اس کے پڑھنے والوں کا ایک مخصوص حلقہ ہے جو یوں تو ہندوستان، پاکستان، انگلستان اور امریکہ میں پھیلا ہوا ہے، لیکن قارئین کی تعداد کو شمار کیا جائے تو یہ مختصر سا خاندان دکھائی دیتا ہے۔ ہم اقبال ریویو کو ایک خاص مقصد کے تحت شائع کرتے ہیں۔ یوں تو اقبال کی وفات کو ستر سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ابھی بھی نہ جانے کتنے ایسے نازک نکات باقی ہیں جن پر ہمارے دانشوروں اور اقبال شناسوں کو قلم اٹھانا باقی ہے۔ آج ساری دنیا اور مغربی ممالک میں اقبال پر تعارفی کام ہو رہا ہے عالمی کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں۔ لیکن جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے یہ احساس ہوتا ہے کہ خصوصاً برصغیر سے باہر کے ممالک میں ان کے اپنے مسائل کے تناظر میں اقبال کو جدت فکر سے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ روایتی موضوعات کے ذریعہ اقبال کے افکار کو پیش کرنا مغربی دنیا کے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث نہیں بن سکتا۔ وہ ادارے جو مالی اعتبار سے مستحکم ہیں اور زیادہ وسائل رکھتے ہیں اس جانب توجہ کریں تو اقبال شناسی اور تفہیم اقبال کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اقبال اکیڈیمی اپنے وسائل کے اعتبار سے اس کام کو بہتر انداز میں انجام نہیں دے سکتی۔ وسیع تر پس منظر میں اس جملۂ معترضہ کا مقصد یہ ہے کہ اس کاروان فکر کو صحیح سمت دی جائے تا کہ اس پُر آشوب دور میں فکرِ اقبال سے کچھ روشنی مل سکے۔

ہندوستان کے حالات کچھ جداگانہ اور مختلف رہے۔ یہاں پیام اقبال پیش کرنے کے تقاضوں کی ترجیحات علیحدہ ہیں۔ 1977ء میں جب اکیڈیمی نے اقبال ریویو کی اجرائی کا فیصلہ کیا تو اس وقت بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ ایک دشوار راستہ ہے اس سفر کی سمت ضرور متعین رہی ہے۔ لیکن شاید واضح نہیں تھی۔ اپنے ہی اس کے مقاصد کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے، اوروں کی

بات کا نہ ذکر ہے نہ گلہ۔ اِس میں ہماری اپنی کوتاہیوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ چنانچہ دس شماروں کی اشاعت کے بعد مالی دشواریوں کے سبب ریویو کی اشاعت (جس کی معیاد اس وقت سہ ماہی تھی مسدود کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا)۔ 1992ء میں ایک شش ماہی جریدہ کی حیثیت سے دوبارہ جاری ہوا اور الحمد للہ اس کا سلسلہ پابندی سے جاری ہے۔ شاید یہاں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ بات اقبال ریویو کے سفر کی ہو رہی ہے نہ کہ اقبال اکیڈیمی کی دیگر مساعی کی۔ دیگر شعبوں میں اکیڈیمی کی کارکردگی نہ صرف اطمینان بخش بلکہ نتیجہ خیز رہی ہے۔ یہاں اقبال اکیڈیمی کی مساعی کی رپورٹ پیش کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کے ترجمان کی حیثیت سے ریویو کا ذکر پیش نظر ہے۔ اپنے محدود وسائل اور دشواریوں کے باوجود اقبال ریویو نے فکر اقبال کی پذیرائی، تحقیق اور تخلیق میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ بے محل نہ ہوگا اگر صرف چند پہلوؤں کا تذکرہ کیا جائے۔

ریویو کے بعض شمارے گرانقدر مواد کے اعتبار سے دستاویزی نوعیت رکھتے ہیں خصوصاً اے پی اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ میں موجود مسئلہ میں اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط، حالات اور تحقیق کے نئے گوشوں پر مشتمل جناب سید شکیل احمد کے مرتب کردہ تحقیقی مقالہ کو نہ صرف برصغیر بلکہ دیگر ممالک میں نہایت پسندیدگی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ''اقبال اور خواتین دکن'' مجلہ عثمانیہ میں اقبالیات پر 1938 تک شائع ہونے والے مضامین کا انتخاب، حیدرآباد کے ممتاز ماہرین اقبالیات، اساتذۂ جامعہ عثمانیہ کے تعارف اور مضامین بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ چند معاصرین حیدرآباد کے نام اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط۔ شخصیات پر ''نذر سید خلیل اللہ حسینی''، اقبالیاتِ ماجد (مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی اقبالیات پر تحریریں)، جامعہ عثمانیہ کے استاد اقبالیاتِ باقی (جناب عبدالقیوم خان باقی کے مضامین) کے علاوہ پروفیسر سید غلام دستگیر رشید اور جناب مصلح الدین سعدی پر خصوصی نمبرات شائع ہوئے۔ مولانا جلال الدین رومی کے 800 سو سالہ یوم پیدائش موقع پر اقبال اور رومی کی خصوصی اشاعت عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ بہادر یار جنگ نمبر اور پروفیسر سید سراج الدین نمبر بھی شائع کئے گئے۔ اقبال کی اہم نظموں ''مسجد قرطبہ'' اور ''ساقی نامہ'' پر مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا۔ مطالعہ اقبال، آہنگ غالب کے پس منظر میں اقبال کی شعری زبان کا ارتقاء، مطالعہ اقبالیات میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اس موضوع پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا گیا۔ بعض خصوصی شماروں کو علیحدہ کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ اقبال کے

حوالہ سے سائنسی مضامین کے علاوہ، انا میری شمل اور فیض احمد فیض پر خصوصی گوشے بھی اقبال ریویو کے قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کئے گئے۔ غرض ہر شمارہ جو ہم شائع کرتے ہیں اس کے پیچھے کدو کاوش کی ایک داستان چھپی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ہر شمارہ میں شامل اعلیٰ مضامین بھی اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ انگریزی میں مضامین کا ایک گوشہ بھی شامل کیا جارہا ہے۔ یہ چند پہلو ریویو کے علمی سفر چند اہم سنگ میل ہیں۔ ابھی نہ جانے کتنے اور اہم پہلو ہیں جن میں اقبال شناسوں کو قدم اٹھانا ہے ہم اپنے قلمی معاونین اور نئے قلمکاروں کی نگارشات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

اقبال اکیڈیمی کا قیام 1959 میں عمل میں آیا۔ 1977ء میں اقبال ریویو کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس بار یہ خیال ہوا ہے کہ اس عرصہ میں اقبال ریویو کے جتنے شمارے شائع ہوئے ان پر ایک نظر ڈالی جائے اور بعض اہم اور فکر انگریز مضامین کا انتخاب شائع کیا جائے۔ اگر چہ نہایت قابل اساتذہ اور دانشوروں کے عالمانہ مضامین ریویو میں شائع ہوئے لیکن اس انتخاب میں صرف پانچ مضامین پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ مضامین ان شخصیتوں کے تحریر کردہ ہیں جو ہمارے درمیان اب موجود نہیں ہیں، لیکن اقبال اکیڈیمی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کرسکتی۔ اقبال اکیڈیمی سے ان کی وابستگی، ان کی تحریریں، ان کی تقاریر نے اکیڈیمی کو ایک اعلیٰ معیار اور وقار عطا کیا۔

ان کرم فرما محسنین کے اسمائے گرامی جن کے مضامین کا انتخاب کیا گیا ہے یوں ہیں:

۱۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی مرحوم: جو نہ صرف اقبال اکیڈیمی کی روح رواں بلکہ بانی اور صدر بھی رہے، انہوں نے پژمردہ دلوں کو از سر نو اُمنگ اور حوصلے سے آشنا کیا۔ نوجوانوں کی تربیت کی اور ان میں تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کی۔ اکیڈیمی کے پلیٹ فارم پر خلیل صاحب نے کئی نامور اہل قلم کو جمع کیا۔ خلیل اللہ حسینی مرحوم ان بے باک مجاہدین میں تھے جنہیں صلے اور ستائش کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ملی مفاد ان کے لئے سب کچھ تھا۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی ذات کیلئے کچھ نہیں کیا۔

۲۔ پروفیسر سید صلاح الدین مرحوم: صلاح الدین صاحب اسلام، فلسفہ، نفسیات، انگریزی اور فارسی ادبیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں وہ صدر شعبۂ فلسفہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے لکچرس سے کئی اہل علم نے استفادہ کیا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لکچرس کا مجموعہ ''افکار تازہ'' کے نام سے اقبال اکیڈیمی نے شائع کیا تھا۔

۳۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید مرحوم: ایک بلند پایہ عالم اور صوفی تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ حوصلہ شکن حالات میں بھی انہوں نے حیدرآباد کی علمی روایات کو برقرار رکھا۔ ان کا خاص موضوع سیرتِ طیبہ تھا۔ سیرت طیبہ اور کلام اقبال پر اُن کی تقاریر نہایت معلومات افزا اور دلچسپ ہوتی تھیں۔

۴۔ پروفیسر عالم خوندمیری: اکیڈیمی کے پہلے صدر تھے۔ ان کی شخصیت قدیم وجدید کا سنگم تھی۔ ان کی دلنوازی، فکر کی گہرائی اور حکیمانہ نظر، منکسر المزاجی ایسی خصوصیات تھیں جو ہر ایک کو ان کا گرویدہ بنادیتی تھیں۔ ''اقبال کا فلسفہ زماں ومکاں'' ان کا خاص موضوع تھا جس پر انہوں نے ڈاکٹریٹ کیا تھا۔ اقبالیات پر ان کی معرکۃ الآراء کتاب ''اقبال کشش اور گریز'' نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کو شائع کرنے کا سہرا بھی اقبال اکیڈیمی کے سر ہے۔

۵۔ پروفیسر سید سراج الدین صاحب: کا انتقال ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے۔ بس یوں لگتا ہے کہ۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

سراج صاحب، انگریزی کے پروفیسر تھے۔ مغربی ادبیات پر گہری نظر تھی۔ وہ فارسی کے بھی عالم تھے۔ انکسار اور سادگی ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ ''مطالعہ اقبال، چند نئے زاویے'' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ عمر کے آخری دنوں میں انہوں نے جاوید نامے کا نہایت دل کش ترجمہ کیا تھا جو منظوم نہ ہوتے ہوئے بھی منظوم لگتا ہے۔ جاوید نامے کا یہ ترجمہ سراج صاحب کے انتقال کے بعد اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔

اقبال ریویو کا یہ شمارہ ہمارے بزرگوں کی خدمت میں ایک خراج عقیدت ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے یہ شمارہ مختصر سہی لیکن مضامین کے اعلیٰ معیار کے لحاظ سے نہایت وقیع ہے۔

(سید امتیاز الدین)

☆☆☆

سید خلیل اللہ حسینی
بانی وسابق صدر اقبال اکیڈیمی وتعمیر ملت

اگر خواہی حیات اندر خطرزی

(موصوف کی تصنیف ''اسلام کا روشن مستقبل'' میں شامل ایک مضمون کی تلخیص)

حضرت اقبال اسلام کے بہت بڑے مفکر تھے جس طرح ایک زمانہ میں مولانا رومؒ نے تجدید اور احیائے اسلام کا کام کیا تھا ان کی مثنوی کو لوگ ''ہست قرآن در زبان پہلوی'' کہنے لگے تھے۔ اسی طرح اس دور پُرفتن میں اقبال نے اسلامی تعلیمات کو اشعار کے روپ میں بڑی عمدگی سے پیش کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام کو قرآن وسنت کی ایسی تشریح بنا کر پیش کیا جو عصر حاضر کے اصحاب کے لئے قابل قبول ہے۔ ان کا کلام اردو اور فارسی میں ہے۔ انہوں نے خدا سے التجا کی کہ اگر ان کے کلام میں قرآن سے ہٹ کر کوئی بات ہو تو قیامت کے روز انہیں نبی محترمؐ کے قدموں کو بوسہ دینے کی سعادت سے محروم کر دیا جائے۔ ویسے اقبال نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا اور بھٹکتے ہوئے آہو کو سوئے حرم چلنے کی تعلیم دی۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اقبال کے اشعار سن کر ایسے محو ہوئے کہ ان کے اس پیام کو بھلا بیٹھے جو ان اشعار میں موجود تھا۔ خود اقبال نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ لوگوں نے انہیں صرف شاعر سمجھا اور ان کے پیام نظر انداز کر دیا۔ اسی لئے اقبال نے اپنے قارئین سے کہا ہے کہ

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مئے خانہ

یہ عجیب بات ہے کہ آغوش مغرب میں تعلیم پانے والے اقبال کے پاس اسلام کی زیادہ صحیح ترجمانی ملتی ہے۔ انہوں نے بالکل صحیح طور پر اندازہ لگایا کہ عام انسانوں کی پستی اور ذلت کا سبب خوف ہوتا ہے اور اسلام نے ہر انسان کو بے خوف بنایا یہ وہ نکتہ ہے جس پر پہلی دو تحریکات نے کوئی توجہ نہیں دی۔

اقبال کا نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود کلمہ طیبہ وہ انقلابی پیام ہے جس کا مقصد ایک خدا سے ڈرنے اور ساری کائنات سے بے خوف بناتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے کہا ہے۔

این دو حرف لاالہٰ گفتار نیست
لاالہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است
لاالہٰ ضرب است وضرب کاری است

(جاوید نامہ) خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادِ نو)

(ترجمہ: لاالہ محض گفتار کے دو حرف نہیں ہیں بلکہ یہ ایک خطانہ کرنے والی تلوار کی طرح ہیں۔ قہاری اسی کے سوز کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ لاالہ ایک ضرب اور کاری ضرب ہے۔)

اسی بناء پر انہوں نے کہا کہ مسلمان ہونے کا مطلب وہ اقدام شوق ہے جو جذبہ شہادت پر ختم ہوتا ہے۔

یہ شہادت گہہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کلمہ طیبہ نے مسلمانوں میں جو بے خوفی پیدا کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ خود قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پر اپنے ماننے والوں کو بے خوف اور بے جگر بننے کی تلقین کی۔ اقبال نے بھی بے خوفی اور جرأت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

مثل کلیمؑ ہوا گر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگ ''لاتخف'' (بال جبریل)

اقبال نے اس نقطہ نظر کو پیش کیا ہے کہ یاس، خوف وحزن ام الخبائث ہیں اور اس کا علاج توحید ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

مرگ را سامان ز قطع آرزو است
زندگانی محکم از ''لا تقنطوا'' است
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیم ''لاتحزن'' بگیر

گر خدا داری زِغم آزادشو
از خیالِ بیش وکم آزاد شو
قوتِ ایمان حیات افزایدت
وردِ لاخوف علیھم بایدت
چوں کلیمؑ سُوئے فرعونے رود
قلب اُو از لا تخف محکم شود

(رُموز بے خودی)

ترجمہ:۔آرزو کا ختم ہونا موت ہے۔زندگی صرف لاتقنطوا سے محکم ہوتی ہے اگر تیرا خدا پر اعتماد ہے تُو غم سے آزاد ہوجا اور نفع ونقصان کے خیال سے بے نیاز ہوجا۔قوتِ ایمان حیات افزا ہوتی ہے اسی لئے لاخوف علیھم کا ورد کرتے رہنا چاہئے۔جس طرح موسیٰ کلیم اللہ فرعون کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو ان کا دل حرف لاتخف سے محکم تھا۔

اقبال نے نہ صرف بے خوفی کو سراہا ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ ناموافق حالات اور پُر خطر ماحول ہمارے لئے لائق خیر مقدم ہے۔ہم کو ناموافق حالات سے گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ ان کا استقبال کرنا چاہئے۔وہ کہتے ہیں۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

پیام مشرق میں کہتے ہیں کہ

''اگر خواہی حیات اندر خطر زی'' یعنی زندگی چاہتے ہو تو خطرات میں زندگی بسر کرنا سیکھو۔اس عنوان کی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

دمادم خویشتن را بر فساں زن
ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زن
خطر تاب وتواں را امتحان است
عیار ممکنات جسم وجان است

(پیام مشرق)

(ترجمہ: تو مسلسل اپنے آپ کو خطرات کی کسوٹی پر پرکھا کر اور اسی سے اپنی زندگی کی

شمشیر کی دھار تیز کر خطرات اور مشکلات ، برداشت واستقامت کا امتحان ہیں اور یہی تیری شخصیت کو جانچنے کا معیار ہے۔) اپنی مشہور مثنوی ''مسافر'' میں فرماتے ہیں:۔

بندۂ حق وارثِ پیغمبراں
اُو نہ گنجد درجہانِ دیگراں
تاجہانے دیگرے پیدا کند
ایں جہانِ کہنہ را برہم زند
زندہ مرد از غیرِ حق دارد فراغ
از خودی اندر وجودِ اُو چراغ
پائے اُو محکم برزم خیر وشر
ذکرِ اُو شمشیر و فکر اُو سپر

(خطاب بہ اقوام شرق)

ترجمہ:۔ بندۂ حق پیغمبروں کا وارث ہوتا ہے اور وہ دوسروں کی بسائی ہوئی دنیا میں بسیرا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کہنہ جہاں کو برہم کر کے اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ مرد زندہ ہر غیر حق سے بے خوف رہتا ہے اور اس کے وجود میں اس کی خودی چراغ کے مانند روشن رہتی ہے۔ خیر وشر کی رزم گاہ میں اس کے پاؤں مضبوطی سے جمے رہتے ہیں۔ ذکر اس کی شمشیر اور فکر اس کی سپر ہے۔

اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایمان لانے والا شخص (مومن) ہر طرح کے خوف سے پاک ہو۔ وہ نہ صرف خطرات سے نہ گھبرائے بلکہ خطرات کا خیر مقدم کرے کہ خطرات ہی مخفی صلاحیتوں کے لئے نشو ونما کا کام کرتے ہیں۔

اقبال نے اس علم وفن پر تنقید کی ہے جو انسان کو سپہ گری سے دور کر دیتا ہے انہوں نے ایسے علم وفن کی کوئی اہمیت تسلیم نہیں کی جو انسان کو تیغ وسپر سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

من آن علم و فراست را بپر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ وسپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

(زبور عجم)

ترجمہ: میرے نزدیک اس علم وفراست کی ذرہ برابر وقعت نہیں ہے جو ایک مردِ غازی کو

تیغ وسپر سے بیگانہ کردے۔

ان امور کے علاوہ اقبال ایک چونکا دینے والی بات کہتے ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ انگریزی اقتدار نے ہمارے پورے معاشرے کو ذہنی طور پر غلام بنادیا تھا۔ حتی کہ مولانا الطاف حسین حالی جیسے دردمند شاعر بھی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

یہ نقطہ نظر جیسا دیس ویسا بھیس کے عنوان سے بھی ہمارے رگ وپے میں بس گیا ہے اور پورے معاشرے کا یہ نقطۂ نظر بن گیا ہے کہ وہ سیلاب کے مقابلہ میں ریگ تہہ نشین کی طرح ہموار ہوجائیں اور ایک برتن میں ڈالے ہوئے پانی کی طرح مسطح ہورہیں۔ اقبال نے ہم آہنگی (Adjustment) کے اس نقطہ نظر کو نہیں مانا اور تاریخ اسلام کے واقعات گواہ ہیں کہ اقبال کا نقطہ نظر ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا کام نہیں ہے کہ زمانے سے مطابقت پیدا کرو بلکہ زمانے کا یہ کام ہے کہ تم سے ہم آہنگ ہو۔ اگر نہیں ہوتا ہے تو تمہارا کام ہے کہ اس سے ٹکرا جاؤ اور اس کو مجبور کرو کہ وہ تم سے مطابقت پیدا کرے۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ترجمہ: یہ کہنا کہ تم زمانہ کے ساتھ چلو ان کا قول ہے جو زندگی سے بے خبر ہیں۔ زمانہ تیرے موافق نہیں رہتا تو تجھے چاہئے کہ تو زمانہ سے ٹکرائے (اور اسے اپنے موافق بنائے)

سماجیات کی پوری کتابوں میں حالات سے مطابقت (Adjustment) کی بات کہی جاتی ہے۔ ہم لوگ غلامی کے خوگر ہوگئے ہیں۔ اس لئے ہر ناموافق ماحول میں مطابقت کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم آہنگی ہمارا بنیادی اصول ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارا طرز عمل مصلحت کے تابع رہتا ہے اور ہم کشمکش و پیکار سے بچنا چاہتے ہیں۔ اقبال نے کشمکش اور تصادم کو بڑی اہمیت دی ہے اور ساری پرانی قدروں کو مسمار کردیا ہے۔ انہوں نے زمانے سے ٹکرانے کی بات کہی ہے اور تصادم کی تعریف یوں کی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

حیات شعلہ مزاج وغیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفاطلبی
اسی کشاکش پیہم زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب وتابِ ملّتِ عربی

(بانگ درا۔ارتقاء)

ضرب کلیم میں بالکل ابتدائی اشعار یہ ہیں

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہونہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست وضربت کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کرنوائے چنگ
خون دل وجگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے ، غافل نہ جلترنگ

(ناظرین سے)

مروجہ خیال یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے اپنے آپ کو زمانے کے رنگ میں رنگ لیا جائے اور حالات جیسے ہوں بجائے ان کا مقابلہ کرنے کے ان سے ہم آہنگی یا مطابقت پیدا کر لی جائے۔صدیوں سے غلامی کے خوگر عوام اس نقطۂ نظر کے حامل ہو گئے ہیں کہ تصادم میں خطرہ ہے، توافق میں عافیت ہے۔مزاحمت خطرے کی گھنٹی ہے، مصلحت بینی باعث مسرت ہے مسلمانوں میں یہ بات آہستہ آہستہ سرایت کر گئی اور اب وہ سونے کا ہمالہ نہیں ہے بلکہ مٹی کا ڈھیر بن گئے ہیں۔کسی اہل علم، اور اہل قلم نے سماج کے اس ناسور کی طرف نظر نہیں کی۔یہ اقبال ہی کی بالغ نظری تھی کہ انہوں نے ایک طرف توافرادِ ملت کے ذہن سے خوفِ غیر اللہ کو مٹانے کی کوشش کی اس طرح ان کو خطر پسند بننے کی ترغیب دی۔اس کے علاوہ ان میں یہ جارحانہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ اپنے ماحول سے مرعوب یا متاثر نہ ہوں۔اپنے آپ کو ماحول کے رنگ میں رنگے جانے کی فکر نہ کریں بلکہ اقبال نے یہ چونکا دینے والی بات کہی کہ مومن زمانہ کا نقاد ہوتا ہے وہ زمانہ کا اثر قبول نہیں کرتا بلکہ زمانہ کو متاثر کر دیتا ہے۔اقبال کی مشہور نظم، سلطان ٹیپو کی وصیت ہے جس میں وہ یہ کہتے ہیں۔

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول
(ضرب کلیم)

گویا مومن کا کام اقبال کے نقطۂ نظر سے محفل گدازی ہے ماحول کا اثر قبول کرنا نہیں

ایک مقام پر وہ کہتے ہیں

آزر کا پیشہ خارا تراشی
کارِ خلیلان خارا گدازی

انہوں نے مسلمانوں کی زندگی کو سراپا عبادت قرار دیا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ توحید کی گواہی دین، مشرکانہ عقائد پر برق بن کر گریں۔ وہ کہتے ہیں۔

اگر چہ بت ہیں جماعت کے آستینوں میں
مجھے ہے حکم اِذاں لا الہ الا اللہ (ضرب کلیم)

گویا مومن توحید کی شہادت دینے کے لئے اور اپنے ماحول کو جس میں خدا کی یکتائی کے آثار نہ ہوں یا کم ہوں اس کو حکم کہ وہ خود بدل دے اور مومن کے مزاج کے ہم آہنگ ہو جائے۔

اقبال یہ کہتے ہیں کہ ایسے ماحول سے ٹکرا جاؤ اور ایسے زمانہ کو بدل دو جو تم سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ اقبال کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسی تصادم و پیکار میں ملت کی مخفی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔

اسمائے علی مرتضیٰؓ کی شرح میں اسرارِ خودی میں کہتے ہیں کہ مرد خوددار زمانہ سے ہم آہنگ نہیں ہوتا بلکہ وہ موجود کو بدل کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
بامزاجِ اُو بسازد روزگار
گرنہ ساز با مزاجِ اُو جہاں
برکند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیب نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند
چرخ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوت خود آشکار

روزگارِ نوکہ باشد ساز گار

(اسرارخودی)

ترجمہ: ''جب مردخوددار پختہ کار بن جاتا ہے تو زمانہ اپنے آپ کو اس کا موافق بنالیتا ہے۔ اگر زمانہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو تو مردحق آسمان سے بھی جنگ پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ وہ عالم موجود کی بنیاد ڈھا کر ذرات کو نئی ترکیب عطا کرتا ہے زمانہ کی گردش کو پلٹ دیتا ہے اور نیلے آسمان کو درہم برہم کردیتا ہے۔ وہ اپنی قوت سے ایک ایسی نئی دنیا پیدا کرتا ہے جو اس کے لئے سازگار بن جاتی ہے''۔

آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ مخالف اور متصادم ماحول میں انسانی جوہر کی نشو ونما ہوتی ہے۔

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خودرا از مہمات عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکناتِ قوت مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

(اسرارخودی)

ترجمہ: جو قلب سلیم کا مالک ہوتا ہے وہ بڑی بڑی مہمات کے ذریعہ اپنے زور اور قوت کو آزماتا ہے، دشواریوں کا مقابلہ عشق کے لئے خوشی کا سامان ہے جس طرح ابراہیم خلیل اللہؑ نے دہکتے ہوئے شعلوں سے پھول چن کر مسرت محسوس کی۔ میدان عمل میں جواں مردوں کی قوت کے امکانات مشکل پسندی ہی سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اسی بے خوفی کی تعلیم اس نظم میں ملتی ہے جس کا عنوان، خطاب بہ ظاہر شاہ (شاہ افغانستان) ہے۔

برخور از قرآن اگر خواہی ثبات
در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
می دہد مارا پیامِ لا تخف
می رساند برمقام لا تخف
قوت سلطان ومیر از لاالہ

ہیبت مردِ فقیر از لاالٰہ

(مثنوی مسافر)

ترجمہ: اگر تو ثبات چاہتا ہے تو قرآن سے آب حیات حاصل کر۔ قرآن بے خوفی کا پیام دے کر ہر خوف سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ سلطان و میر کی قوت لا الٰہ ہی سے ہے اور ایک مرد فقیر اللہ ہی کے خوف سے ترساں رہتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اقبال اپنی سکون پسند ملت کو حرکت میں لانا چاہتے ہیں۔ اور ان ساری رکاوٹوں پر تیشہ برساتے ہیں جو کشمکش اور پیکار اور جہد و جہاد کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خوف جو ہر طرح کی کمزوریوں اور سماجی برائیوں کی جڑ ہے۔ اس طرح مصلحت پسندی اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ زمانہ کا رنگ دیکھ کر کام کرو اور جیسے حالت ہوں اس کے مطابق اقدام کرو۔

غرض اقبال نے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے بے خوفی کی تعلیم دی۔

مصلحت پسندی سے نفرت دلائی ہے۔ تصادم و پیکار کی بات کہی، سکوت پسندی جو مصلحت کا لازمی تقاضہ ہے، اس سے بیزارگی کا اظہار کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اقبال خطر پسندی کی تعلیم دیتے ہیں کہ انسان خطرات سے نہ گھبرائے بلکہ ان کا خیر مقدم کرے کہ خطرات کے اندر سے انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اگر حالات ناسازگار ہوں، مصائب اور مشکلات کا ہجوم ہو تو انسان مایوس اور خوفزدہ نہ ہو بلکہ حکمت و تدبر سے اپنے اندر وہ صلاحیت اور اہلیت پیدا کرے کہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق اپنے ماحول پر اثر انداز ہو سکے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور اس خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

☆☆☆

پروفیسر غلام دستگیر رشید
سابق صدر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ

صبح مراد! اُردو نثر کا اقبال
انقلابی ادب کا معیار

(مضامین اقبال مرتبہ تصدیق حسین تاج، مطبوعہ ۱۹۴۳ء کا پیش لفظ)

خوش بیا صبحِ مراد آوردہٗ
ہر شجر رانخلِ سینا کردہٗ (اقبالؒ)

حق مغفرت کرے ترجمانِ حقیقت اقبالؒ نے اپنے شعر کو ''ضربِ کلیم'' بنا کر فکر کی تطہیر اور تعمیر کا سامان بہم پہنچایا۔ اس کا فیض روز افزوں ہے۔ ان کی ''نوائے پختہ'' کی صحبت انسانیت کے ساتھ ''گردشِ دیگر دہم ایام را'' (میں زمانہ کو انقلاب بخشتا ہوں) کا وعدہ پورا کر رہی ہے۔

لیکن اس روشن ضمیر، مہر منیر نے اپنی منظوم تصانیف کے علاوہ نثر میں بھی ''عفتِ فکر'' اور گرمیٔ ذکر'' کا گرانقدر ورثہ چھوڑا ہے۔ یہ ہماری زندگی اور حریت کیلئے ''فروغِ صبح'' کا مصداق ہے کہ ؎

زندگی از گرمیٔ ذکر است وبس حریت از عفتِ فکر است وبس

اب تک اقبالؒ کے انگریزی خطبات تو دو بار شائع ہو چکے ہیں لیکن اردو مضامین اور مقالات کو یکجا شائع کرنے کی سعادت پہلی بار جناب تصدق حسین صاحب تاج (مالک احمدیہ پریس) نے حاصل فرمائی ہے۔ انہیں ان مضامین کی فراہمی میں خاص ''ذوقِ جستجو'' سے کام لینا پڑا۔ کیونکہ یہ صحائفِ حکمت تقریباً مومن کی گمشدہ پونجی بن چکے تھے۔ یہ سعادت دراصل ''سعادتِ خِرد'' ہے۔ انہوں نے جب یہ اوراق میرے سپرد فرمائے تو میرے لئے ان کی زیارت طلوعِ صبح مراد تھی! دل نے بے اختیار خیر مقدم میں کہا ؎

خوش بیا صبحِ مراد آوردہٗ

میں نے ایک سفر میں ان کا مطالعہ کیا۔ یہ سفر عالمِ معنیٰ کا سفر ثابت ہوا، [illegible] کہئے کہ

آسمان حکمت پر سفر معراج تھا۔ گویا یہ اقبالؒ کا منثور جاوید نامہ ہے۔

انقلاب پرور اور ترقی پسند ادیب کا معیار اور مظاہرہ

یہ مرد خبیر اقبالؒ کی اردو نثر ہے۔ سچ پوچھئے تو اردو نثر کا اقبال ہے۔ ان دنوں انقلابی افکار کا بڑا زور ہے، ترقی پسند ادب کا بڑا شور ہے۔ مضامین اقبال اردو ادب کے عظیم الشان انقلابی مظاہر ہیں۔ یہ ترقی پسند ادب کا معیار ہیں۔ دلیل راہ ہیں۔ ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کا سنگِ بنیاد ہیں۔ ان مضامین کی اشاعت اردو نثر میں انقلاب پرور، اور ترقی پسند حکیمانہ ادب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ یہ مضامین ہمیں احتساب کائنات کے حکیمانہ طریقے بھاتے ہیں، انسانی مسائل پر فکر و تدبر کے سلیقہ سے آشنا کراتے ہیں۔

ادب برائے زندگی

عہد آفریں اقبالؒ نے ہمارے حکما، شاعروں اور ادیبوں میں سب سے پہلے، ہر مذموم کو محمود بنانے والے ''آرٹ برائے آرٹ'' اور ''ادب برائے ادب'' کے نظریہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس تصور کو حکیمانہ دلائل اور عمرانی تجربات سے مدلل کیا۔ ان کی اولین تصنیف اسرار خودی اٹھائیے۔ حقیقتِ شعر اور اصلاحِ ادبیات پر ایک طویل عارفانہ نظم ہے۔ جن میں ان نظریات پر تنقید ہے۔ پھر اسلامی ادبیات پر ان کی تطبیق ہے۔ جاوید نامہ بھی اس نکتہ پر واضح بحث ہے۔ ''آرٹ برائے آرٹ'' کے اصول میں اقبال کے نزدیک حسن کا ایک ایسا تصور رہ جاتا ہے جس میں صداقت اس کے جزو لازم و لاینفک کے طور پر باقی نہیں رہتی۔ (حسن اُو را باصداقت کار نیست) ایسے آرٹ اور ادب سے خستہ جاں قوموں کی خستہ جانی اور ناتواں ملتوں کی ناتوانی روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

فکرِ صالح دَر ادب

اس لیے معیار ادب اقبالؒ کے نزدیک اُس کی حیات بخشی کی صلاحیت ہے۔ اور ادب اور آرٹ حیات انسانی کے تابع ہیں۔ وہ ادب میں فکرِ صالح کے طالب ہیں تاکہ آرٹ اور ادب پیکار حیات سے میل کھا سکیں اور اجتماعی تعمیر کے امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کریں۔ وسواس و ہراس کو دلوں سے دور کریں۔ کوہ گراں کو کاہ بنا دیں۔

اس مجموعہ میں دو مضامین اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ ایک جناب رسالتمآبؐ کا ادبی تبصرہ دوسرا دیباچہ مرقع چغتائی۔ انجمن ادبی کابل کی تقریر کا بھی یہی موضوع ہے۔ اقبالؒ نے ان

مقالات میں یہ دکھایا ہے کہ پیغمبر اسلام کے وجدان نے کس طرح اس باب میں انسانی فکر وادب کی رہنمائی فرمائی ہے۔

اشترا کی اور ترقی پسند ادیب اس نکتہ کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ بڑے زور سے اقبال کی طرح ادب برائے زندگی کا پرچار کیا جارہا ہے۔ دونوں کا فرق خود زندگی کی بابت ان کے تصورات میں ملتا ہے۔ اشترا کی زندگی کو صرف مادی پیمانہ امروز وفردا سے ناپتے ہیں۔ دانائے راز اقبالؒ کا تصور حیات وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ ان کی نگاہ اور عقیدہ میں زندگی کے تسلسل، توسیع اور استحکام کے امکانات اور لوازم کا دائرہ حد بندی سے بالاتر ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی

میرا یہ یقین محکم ہے کہ ایک دن اشترا کی ادیب پیہم فکر وتجربہ کی بدولت اقبالؒ کی تیر بینی اور دوررسی کے قائل ہو جائیں گے۔ فکر ونظر کا یہ اتحاد اپنے وقت پر ارتقاء کی قدرتی منازل طے کر لیگا اور غلام آباد ہند اور مظلوم انسانیت کے لئے وہ ساعت سعید ہوگی۔

حضور اقبال میں

ان مضامین کو پڑھنا حضور اقبالؒ میں پہنچنا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائیگا آنکھیں کھلتی جائیں گی اور سر جھکتا جائے گا۔ ''شعر اقبال'' سے تو آپ بار بار ملتے ہیں۔ اب ''ڈاکٹر اقبال'' سے ملئے۔ ان کے دلِ ناصبور کی حرکت اور تڑپ دیکھ چکے ہیں۔ ان اوراق میں ان کے علم وہنر کا سرور محسوس فرمایئے۔ ان کے اشعار کا ''جمالِ دلبری'' بے نقاب ہو چکا ہے۔ یہاں ان کی حکمت کے ''جلالِ قاہری'' کا نظارہ کیجئے۔ ان اوراق میں ان کے عشق کا جنون عقل ذوفنون بن گیا ہے۔ ان کے شعر میں آہِ صبحگاہی حامل حیات ہے تو نثر میں دوررس نگاہ پیامِ انقلاب ہے۔ ان کی صحبت خزف کو دُر بناتی تھی تو ان کی حکمت ''تہی'' کو ''پُر'' کر دیتی ہے۔ ان مضامین سے اقبالؒ کے بعض مبہم اور مشکل تصورات معین اور واضح ہو جاتے ہیں۔ بعض مجمل نکات مفصل توجیہات کے آئینہ میں اُجاگر ہوتے ہیں۔

انقلاب افکار، ترقی پسند ادب

اُن کے احساسات کی طرح خود شناس اقبالؒ کے افکار، ان کے باطن کا ایک سیلِ بے پناہ ہیں۔ ان مضامین میں ایک بندۂ خدا مست نے باطل کے ہر کہن بتخانہ کو شکست کا چیلنج دیا ہے۔ باطل اقدار کی جگہ ترقی پرور اقدار پیش کئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ذہن انسانی کو دگرگوں کر دیں

تا کہ وہ جہانِ دیگر پیدا کر سکے۔ ان کے افکار سے بحر و بر میں انقلاب کا طوفان برپا کیا جا سکتا ہے۔ سامراج اور سرمایہ کے خلاف وہ مارکس وغیرہ کی نفی (لا) کی بے حد تحسین کرتے ہیں۔

اقبالؒ ادب و فلسفہ کے علاوہ عمرانیات کے نہایت بالغ نظر عالم اور ماہر ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال کے اصول اور قوانین پر ان کی دور رس نظر ہے۔ حکمتِ ایمانی اور مصلحتِ عمرانی کا مطالعہ ایک دوسرے سے تعلق کی روشنی میں خوب کیا ہے۔ اسی مطالعہ کا نتیجہ رموز بیخودی ہے۔ اس مجموعہ کے اکثر ممتاز مضامین کا موضوع بحث یہی ایمانی حقیقتیں اور عمرانی حکمتیں ہیں۔ مثلاً ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، قومی زندگی، خطبۂ صدارت، جغرافی حدود اور قومیت وغیرہ ان کی منظوم تصانیف کی طرح خود ان کے اپنے الفاظ میں ان مضامین کی غایت بھی

> ''ان اخلاقی، مذہبی، ملی حقائق کو پیش نظر لاتا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ تا کہ افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو۔ ان کے نزدیک انسانی تربیت و رہنمائی کی تاریخ میں ہی مقامِ محمدیؐ ہے۔
>
> ''نبوتِ محمدیہؐ'' کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیت قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان کو ان تمام آلودگیوں سے پاک کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیجاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے یہ ہے مقامِ محمدیؐ یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ کا''۔

(مضامین اقبال ص ۱۹۲)

سمجھا جاتا ہے کہ اقبال کی اسلام کے ساتھ گرویدگی گروہ بندی یا فرقہ پسندی کے مذاق پر مبنی ہے حالانکہ صورت حال برعکس ہے۔ یہ خیال لاعلمی یا نارسائی کے باعث ہے اس کا سبب بزبانِ اقبال سنیئے۔

> اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوام انسانی امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی

ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا (مضامین اقبال ص ۱۸۳)

مسلمانوں سے مخصوص خطاب کا منشاء بھی یہی ہوتا ہے کہ مدعیان اسلام کو نسبت محمدیؐ کے حق ادا کرنے پر آمادہ کیا جائے جو انسانیت کے حق میں عین رحمت ہے۔

معاشی اتحاد و انقلاب اور وطن دوست اقبال

اقبال مشترک مفادات میں بیجا تعصب کے ہرگز حامی نہیں، وہ تعاون کے داعی ہیں، قرآنی تعلیم کی دعوت بھی یہی ہے۔ تعالوا الیٰ کلمة سواء بیننا و بینکم (مشترک کلمہ و نکتہ پر تعاون کرو)

''سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کیلئے اپنے آپ کو وقف کرتا ہے یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے اس کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈالکر ان اسباب کا پتہ لگائے جنہوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی اس حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آجکل کی دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں، جو شخص اس گتھی کو سلجھانے کا بیڑا اٹھائے اسے چاہئے کہ مذہب و ملت کے اختلافات کی طرف سے خالی الذہن ہو جائے اور کسی ایک جماعت کی طرفداری یا پاسداری کے خیال کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے اس لئے کہ اقتصادی قوتیں تمام قوموں پر اپنا عمل یکساں کرتی ہیں''۔

(مضامین اقبال ص ۱۰۴)

اقبال کے لکھے ہوئے اپنے مختلف دواوین کے دیباچے اس میں شریک ہیں جن مقاصد اور اصول کا ان میں اظہار ہے ان میں سے اکثر خصوصیات مضامین اقبال پر بھی صادق آتی ہیں۔ خصوصاً رموز بیخودی اور پیام مشرق کے تمہیدی بیانات!

مضمون ''ختم نبوت'' اقبالؒ کے کئی بنیادی افکار کا نچوڑ ہے۔ یہ ان کے ایک اہم انگریزی مقالہ کا ترجمہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض طنزیہ استفسارات و تنقیحات کے جواب میں سپرد قلم کیا گیا تھا۔ اس میں ''محکوم کے الہام'' کے نفسیاتی اور اجتماعی نتائج کا بڑی نکتہ رسی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ عنوان

اگر چہ مذہبی ہے لیکن نفسیات اجتماع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے گراں قدر سرمائیہ عبرت رکھتا ہے۔

ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ ''آدھی قوم'' کی غلامی سے امریکہ آزاد نہیں رہ سکتا۔ بعض سیاسی جماعتوں کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا تصور دو تہائی ہندوستانیوں (اچھوتوں اور مسلمانوں) کی غلامی پر بناء کیا گیا ہے۔ سیاست کا ایک ایسا خاکہ تیار کیا جارہا تھا کہ ہندوستان کی اس اکثریت کی تقدیر کو اعلیٰ ذات والوں کے سامراج اور سرمایہ کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔ اس طبقہ نے اپنے اقتدار سے ہندوستان کے اصلی باشندوں کو سماجی اور معاشی غلامی کے جس ''اسفل السافلین'' میں پہنچایا ہے وہ استحصال ناجائز کی تاریخ کا نہایت دردناک باب ہے۔ یہ تاریخ ہند کی سب سے زیادہ طویل المدت مظالم کی ایک داستان ہے۔ عمرانیات کے ماہر اقبال اس قوم کے مزاج اجتماعی کو پہچان گئے۔ اس سیاسی چالبازی کا پردہ چاک کیا۔ ان کے خطبۂ صدارت نے انہیں شاعر ہی نہیں بلکہ تاریخ ساز اقبال بنادیا۔ اس نے بتدریج ہندی سیاست کا رخ بدل دیا۔ جسے ابتدا میں محض شاعری کا ایک کرشمہ سمجھا گیا اب وہ ایک قطعی منزل بن گئی۔ ہندوؤں کے غیر متعصب افراد اور انقلاب پسند گروہ بھی ''حق خودارادیت'' کے اس مطالبہ کو حق بجانب سمجھنے لگے ہیں۔ یہ مضمون ہندوستان کے سیاسی ادب کا ایک اہم باب ہے۔ اس میں انہوں نے معنی دین و سیاست پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کے خیالات ہیں جو

> ''اس امر سے مایوس نہیں ہوگیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کراسکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔'' (مضامین اقبال ص ۱۱۲)

یہی قوت مفادات کی ٹکر کو تعاون سے بدل سکتی ہے۔

اُسلوب بیان

مضامینِ اقبال ان بیش بہا تخیلات کے علاوہ جو ''قیامت خرد'' کا مصداق ہیں ہماری زبان کو غیر معمولی حکیمانہ اور عالمانہ اسالیب بیان کی دولت بخشے ہیں۔ انگریزی اور جرمن زبان میں فلسفیانہ کتابیں پڑھیئے۔ عمرانی علوم کے مضامین کا مطالعہ فرمایئے بڑے بڑے ایجاد کار حکماء اور علماء کے اسالیب بیان کا اندازہ کیجئے۔ اسالیب اقبال انہی کے آثار ہیں۔ جدید علوم وفنون پر جو

لوگ اردو میں لکھ رہے ہیں ان کے لئے اقبال کے یہ مضامین معیاری نمونے ہیں۔ کسی قدر عمیق اور دقیق۔ اردو میں یہ طرز تحریر منفرد یعنی آپ اپنی مثال ہے۔ نہایت پختہ اور پرشوکت ہے۔ ادبی چٹخاروں اور شوخیوں سے خالی۔ لیکن کئی ترکیبیں نہایت بلیغ اور نئی ہیں۔ یہ اقبال کی ایجاد اور عطیہ ہیں۔ طرز اظہار سلیس، رواں نہیں، سنجیدہ اور گراں ہے۔ انگریزی کی علمی تحریروں کی طرح جابجا جملے ترکیب در ترکیب کے حامل۔ مطالعہ کئی مقامات پر تکرار کا طالب ہوتا ہے۔

جز بہ محنت نہ شود پا بہ رہِ عشق رواں
اشکِ من خونِ جگر خورد و دویدن آموخت

اقبال کا عام مشغلہ مضمون نویسی یا مقالہ نگاری ہرگز نہ تھا۔ زبان کی لغزشیں کہیں کہیں نمایاں ہیں۔ ابتدا میں جب ان پر اعتراضات کے بم ''صنائع پرستوں'' کی طرف سے برس رہے تھے تو ان کی طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہوگئی لیکن ایک بلند نظر کی طرح ان کو اعتراف تھا کہ

''آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں۔ اگر اہلِ پنجاب مجھ کو ..... بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو ان کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی دشوار گذار وادی ہے کہ بالخصوص ان لوگوں کو جو اہلِ زبان نہیں ہیں۔ یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔'' (مضامین اقبال ص ۲۴)

میں چند اشارات کر چکا۔ اب آپ خود ہی اقبالؒ کے ضمیر پاک، خیالِ بلند اور ذوقِ لطیف سے سیر ہو کر استفادہ کیجئے۔ میں کب تک اہلِ نظر کے حضور ''حرفِ پریشاں'' میں محور ہوں۔

میں نے جب جناب تاجؔ کی فرمائش پر یہ تمہیدی اوراق لکھے تو پشیمانی ہوئی کہ خارِ مغیلاں کو بوستاں کے لئے کیا تحفہ بناؤں۔

ہمیں شرم دارم کہ پائے ملخ را سوئے بارگاہِ سلیمانؑ فرستم
ہمیں ترسم از ریشخندِ ریاحیں کہ خارِ مغیلاں بہ بستاں فرستم

لیکن حسنِ اتفاق سے اس قول پر نظر پڑی کہ گلدستہ کو گیاہِ سبز سے بھی باندھا جاتا ہے۔

بردستۂ گل نیز بہ بندند گیاہ را

تسکین ہوئی کہ یہ حسبِ حال ہے۔ والسلام

○○○

پروفیسر صلاح الدین
سابق صدر شعبہ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ

قرآن اور اقبال

قرآن پاک اسلام کی واحد اور حقیقی بنیاد ہے اور ملتِ اسلامیہ کا مضبوط اور اٹوٹ رشتۂ اتحاد ہے۔ جب تک مسلمان قرآن سے وابستہ رہیں ان کا مستقبل محفوظ اور تابناک رہے گا۔ لیکن محض قرآن کا احترام اور اس سے جذباتی وابستگی خواہ وہ کتنی ہی شدید ہو کافی نہیں ہے ضروری یہ ہے کہ جس پیام خداوندی کا قرآن حامل ہے وہ ذہن میں سرایت کر جائے اور نفس اس کے نفحات سے معطر ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قرآن کو نہ صرف پڑھیں بلکہ اس پر غور وخوص کریں اور اس کے اسرار کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں۔ جرمن مفکر گوئیٹے کا قول ہے۔ Du Gleichstdem Giest Den Du Begseifst (جس چیز کی روح یعنی مائہیت کا تم بخوبی ادراک کرتے ہو اسی شئے کے مانند ہو جاتے ہو۔) اب یہ سوال ہے کہ قرآن کو بخوبی سمجھنے کے لئے ہم کیا طریقہ اختیار کریں۔ اس کے لئے ہم دو طریقے استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اس لئے دونوں ضروری ہیں۔ ہم کسی ایک پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ پہلے طریقہ کی نشان دہی خود قرآن میں کر دی گئی ہے۔ وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ. (س۲۲ آیت ۷۸)

ہمیں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ اس کے معانی ومطالب پر غور کرنا اور اس غور وخوص کو جاری رکھنا چاہئے۔ مگر اس کے ساتھ ایک ضروری احتیاط بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ خدا لامحدود ہے اور پیام خداوندی کی معنوی ثروت بھی لامحدود ہے۔ کسی مقام پر ہمیں شدید احساس ہوگا کہ ہم آیت قرآنی کے حقیقی معنیٰ سمجھ گئے ہیں اور ترغیب ہوگی کہ اس کو آخری اور قطعی سمجھیں اور دوسروں پر اسے مسلط کر دیں۔ اسی ترغیب کی متابعت سے متعدد فرقے پیدا ہوئے اور ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ حق ہمیں ضرور ہے کہ اپنی دریافت کو دوسروں پر پیش کریں لیکن یہ حق نہیں کہ اس کو دوسروں پر مسلط کریں۔ یہی نہیں بلکہ اس اکتشاف کے بعد بھی اپنا تجسس جاری

رکھنا چاہئے۔اس اکتشاف پر قانع رہنا غلطی ہے۔ جہاد فی اللہ جاری رہنا چاہئے کیوں کہ اس کی منزل مقصود ہمارے ادراک سے پرے ہے۔اس اکتشاف پر اصرار کرنا بھی خطا کاری ہے۔کسی آیت کریمہ کے جو معنیٰ ہم پر منکشف ہوتے ہیں اسے بحث ومباحثہ سے منوانے کی قرآن پاک میں صریح ممانعت کی گئی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ آیٰتِ اللّٰہِ ط اَنّٰی یُصْرَفُوْنَ (س۴۰ آیت ۶۹)

(تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، کہاں سے وہ پھرائے جارہے ہیں۔)

آیاتِ قرآنی مشعل ہدایت ہیں۔ان کی روشنی میں صراطِ مستقیم کی تلاش ہمارا فرض ہے۔ انہیں بحث ومباحثہ کا موضوع بنانا بے ادبی ہی نہیں، گمراہی کو دعوت دینا ہے۔ ذاتی تجسس کا طریقہ ثمر آور ہے مگر اس پر اکتفا نہیں کر سکتے۔اس کی تکمیل دوسرے طریقہ سے کرنا چاہئے۔ان صاحب دل بلند پایہ مفکرین کے افکار سے بھی استفادہ کرنا چاہئے۔ جو عرصہ دراز تک قرآن کی معنوی گہرایوں میں غواصی کرتے رہے۔امام غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے علماء کی تحقیقات سے ہمیں قرآن کو سمجھنے میں موثر امداد حاصل ہوسکتی ہے۔ڈاکٹر اقبال کے افکار ہمارے لئے اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ وہ عصرِ جدید کی علمی زبان سے کما حقہ واقف تھے اور قرآنی مطالب کو ان تصورات میں پیش کرتے تھے جو زمانۂ حال کی علمی دنیا میں قابل قبول ہیں۔اس سلسلہ میں پہلا قدم قرآن کے متعلق اقبال کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ہے۔اس کی ابتداء ہم اقبال کے اس شعر سے کر سکتے ہیں۔

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلطی ہوگی کہ اقبال ملا کے بالکلیہ مخالف تھے۔ایک محدود دائرہ میں اس کی اہمیت اور افادیت کا انہیں اعتراف ہے۔انہیں صرف قرآن کے متعلق اس کے زاویہ نگاہ اور مطالب قرآن میں اس کے مقصودِ تلاش سے اختلاف ہے۔ملا قرآن میں دینیات تلاش کرتا ہے اور اقبال دین۔ملا قرآن کی مدد سے اسلام کی ظاہری صورت کا تعین کرنا چاہتا ہے اور اقبال سرچشمۂ اسلام سے آبِ حیات حاصل کرنا۔صورت بھی ضروری ہے۔دین کی بنیاد پر

سماجی تنظیم، انضباط ملت اسی وقت ممکن ہے کہ دین کا مجرد اور لطیف تصور کسی معین صوری نظام میں متشکل ہو۔ ملاّ کی غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ صورت پر اصرار کرتا ہے۔ اس کی غلطی یہ ہے کہ وہ صورت کو ابدی اور دائمی سمجھتا ہے۔ اور سرچشمۂ دین سے اس کی مسلسل آبیاری سے گریز کرتا ہے۔ خدا اور اس کا دین ابدی ہیں کسی زمانہ میں دین جس خاص صورت میں ظاہر ہوا ہے وہ ابدی نہیں ہوسکتی۔ صورت کُلُّ مَنْ علیھا فَان (س۵۵ آیت ۲۶) (ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے) کی تابع ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شان. (س۵۵ آیت ۲۹) (ہر آن وہ نئی شان میں ہے۔) کے تحت ہر زمانہ میں حقیقت مطلقہ کی روشنی میں اس کی تجدید ضروری ہوتی ہے۔ ملاّ کی نظر میں قرآن احکام شرعی کا ماخذ ہے اور اقبال کے لئے قرآن ہم سفر ہے جس کے ساتھ وہ ارتقائے روحانی کے منازل طئے کرنا چاہتا ہے۔ دینیات میں صورت مقید ہے اور دین ایک آزاد حرکی اور تخلیقی قوت ہے۔ اقبال اس قوت کا دامن تھام کر صورت سے بلند ہونا چاہتا ہے۔

صورت نہ پرستم من بُت خانہ شکستم من
آن سیل سبک سیرم ہر بند گستم من

قرآن کے متعلق اپنے زاویہ نگاہ کی تشریح خود اقبال نے واضح طور پر کردی ہے۔

Islam is an aspiration and is not to be completely identifeid with its fulfillment in a particular epoch in a particular shape, life is a creative urge that perpetually creates the forms and perpetually transcends them.Worship of form is idolatory and Islam basically is iconoclastic.

بالکل یہی خیال مولانا روم نے بھی ان لطیف اشعار میں کیا ہے۔

صورت گر نقاشم ہر لحظ بتے سازم
وانگہ ہمہ بت ہارا در پیش تو اندازم
صد نقش بر انگیزم باروح در آمیزم
چونقشِ ترا بینم در آتشش اندازم

اس نقطۂ نظر کو تسلیم کیا جائے تو اسلام کے معاشرتی نظام اور معاشی و معاشرتی ضوابط پر نظرِ ثانی کرنے اور انہیں زمانۂ حال کے مطالبات سے مطابق کرنے کی راہ کھل جاتی ہے۔ یہ نظام دو

حصوں سے مرکب ہے۔ جن میں امتیاز ضروری ہے۔ پہلا حصہ بنیادی ہے اور ایسے اصول پر مشتمل ہے جو انتہائی عمومیت کے حامل اور ابدی ہیں۔ یہ اصول قرآن سے ماخوذ ہیں اور ان میں کسی ردّ و بدل یا کمی بیشی کا ہمیں اختیار نہیں۔ دوسرا حصہ ان مخصوص ضوابط اور معین قواعد پر مشتمل ہے جو کسی زمانے کے خاص سماجی حالات میں بنیادی اصول کے اطلاق کا اظہار کرتے ہیں جو وقتی حالات اور کسی مخصوص زمانے کے مطالبات سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور ان اصول کے حقیقی مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ مثلاً سورہ رحمٰن میں سماجی معاملات کو ایک بنیادی اصول انصاف کا پابند کیا گیا ہے۔

وَاَقِيْمُوْ الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوْ الْمِيْزَانَ (س ۵۵ آیت ۹)

(انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔)

بین الشخصی اور بین الجماعتی تمام معاملات ایسے طئے کئے جائیں کہ کسی کا رمق برابر حق تلف نہ ہو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق بلا کم و کاست ملے۔ کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ اس اصول کے تحت بعض مخصوص معاشی اور معاشرتی قواعد و ضوابط مدون کئے گئے ہیں جو اس زمانے کے سماجی حالات کے متن میں بنیادی اصول کی اصلی غرض و غایت کی تکمیل کرتے تھے۔ بدلے ہوئے حالات میں ہمارا فرض ہے کہ اصول کی روشنی میں قواعد کو جانچتے رہیں اور دیکھتے رہیں کہ متبدل حالات میں مروجہ قواعد سے اصول کی حقیقی غرض و غایت کی تکمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو کس طرح ان میں ایسی ترمیم کی جائے کہ اصول کا اصل مقصد فوت نہ ہو۔ تجارتی لین دین اور وراثت کے قواعد اسی اصول کے تابع ہیں اور اسی کے مطابق انہیں رکھنے کی ضرورت ہر زمانے میں پیش آتی ہے۔ فقہ کا اصول ہے۔ ''لا ینکر تغیر الاحکام بتغیر الزمان وتغیر الامکنه والاحوال'' (اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ احکام میں تبدیلی زمانہ کی تبدیلی، رہائش کی تبدیلی اور حالت کی تبدیلی سے لازم آتی ہے۔)

قرآن اقبال کے ذہن میں سرایت کیا ہوا ہے اور ان کی فکر کے ہر پہلو پر اس کا گہرا اثر ہے اسی لئے ان کا تصوف بھی قرآن سے ماخوذ اور اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ تصوف کے دو اہم مسلک ہیں۔ ایک مسلک کا مقصود حقیقت مطلقہ میں جذب ہے۔ اس مسلک کے صوفی اپنی خودی کو حقیقت منتہائی میں ضم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ خودی کے قید و بند سے رہائی حاصل کر کے الٰہیاتی فضاء کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔ خدا سے وصل کی تمنا انہیں بے تاب

رکھتی ہے۔ لامحدود میں کھو جانے کی آرزو انہیں تڑپاتی رہتی ہے۔ ان کی نظر میں نجات خودی سے نجات ہے ان کا ایقان ہے کہ ''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔''

رو دُروگم شو وصال اینست وبس

یہی ہدایت ان کی رہبری کرتی ہے۔ یہ مقصود اقبال کے لئے کشش نہیں رکھتا۔ وہ کہتے ہیں۔

من ذوق ہم آغوشی دریا نہ خریدم
آن بادہ کہ از خویش رُباید نہ چشیدم (اقبال)

وہ انسان کی خودی کو حقیقی اور کامل سمجھتے ہیں۔

نقطۂ نورے کہ نامِ اُوِ خودی است
زیرِ خاکِ ماشرارِ زندگی است

ان کی نظر میں انسان کا نصب العین تحفظ اور اس کی مسلسل ترقی ہونا چاہئے۔ اسی لئے وہ تصوف کے دوسرے مسلک کے حامی ہیں۔ اس مسلک کا مقصود قربِ خداوندی ہے۔ وہ خدا میں فنا ہونا نہیں اس سے ربط رکھنا چاہتے ہیں اور اس سے قربت کے متمنی رہتے ہیں۔ اور اپنی خودی کی تقویت واستحکام کیلئے خدا سے استعانت کرتے رہتے ہیں۔ خدا سے قربت صوفی کے لئے سرچشمۂ مسرت ہے۔ ایسی مسرت جس سے قلب متلذذ ہوتا ہے مگر جس کے اظہار سے زبان عاجز ہے۔ اس نوعیت کے متعلق اس سے سوال کیا جائے تو اس کا جواب یہی ہوتا ہے کہ

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی

اس کی صرف یہ خواہش رہتی ہے کہ یہ مسرت نہ صرف قائم رہے بلکہ اس میں ازدیاد ہوتا جائے اس کے لئے وہ خدا سے قریب سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ اور خدا کی سمت سفر جاری رکھتا ہے۔ خدا لامحدود ہے اور اس کی طرف سفر بھی لامحدود ہے۔ جرمن صوفی Eckharat کہتا ہے۔

''حسن ازل سے صرف تمنا دائمی قرب حاصل کر سکتی ہے۔''

مولانا روم اور اقبال کے لئے ربط اور قربت کا مقصود ہی کشش رکھتا ہے۔ ربط کے لئے یہ ضروری ہے کہ خودی قائم رہے اور دوئی برقرار۔ رومی کا یہ شعر ربط کی عکاسی کرتا ہے۔

من وتو بے من وتو جمع شویم از سرِ ذوق
خوش وفارغ زِ خرافات پریشاں من وتو

اس کے بعد کا شعر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سرّی قربت کے باوجود ان کی خودی قائم ہے۔

این عجب ترکہ من وتو بہ یکے کنج اینجا
اندریں دم بہ عراقیم وخراساں من وتو

(اس ممکنہ قربت کے باوجود میری خودی قائم ہے۔ میں میں ہوں اور وہ وہ۔ میرا اس سے تعلق ربط کا ہے وصل کا نہیں) دونوں مسالک پر غور کرنے کے بعد ایک مسلمان کیلئے یہ سوال ناگزیر ہے کہ قرآن کس مقصود کی تائید کرتا ہے۔ وہ انسان کو جذب کی دعوت دیتا ہے یا ربط کی۔ اس سوال کا جواب وہی دے سکتے ہیں جو قرآن کے معانی ومطالب میں غواصی کر چکے ہیں۔ یہاں صرف آیت کریمہ پیش کرتا ہوں جو اقبال اور رومی کے مسلک کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔

دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ج وَآخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.(س ۱۰ آیت ۱۰)

(جنتوں) میں ان کا قول ہوگا۔ پاک ہے تو اے اللہ اور اس میں ان کی باہمی دعا سلام ہوگی اور ان کی آخری بات ہوگی کہ ساری تعریف اللہ پروردگار عالمین کے لئے (س۱۰، آیت۱۰)

اس منظر میں محدود ایغووں کی ایسی جماعت کو پیش کیا گیا ہے جو ایک طرف تو آپس میں ہم آہنگی اور خیر سگالی کے جذبات سے مربوط ہے اور دوسری طرف ایغوئے مطلق کیلئے جذباتِ استحسان اور تشکر سے سرشار۔ اور عالمِ وارفتگی میں جذباتِ تشکر وحیرت کا اظہار بے ساختہ کلمات سے کرتے ہیں۔ مومن دیدار الٰہی کا متمنی رہتا ہے مگر کیا حواسِ ظاہری سے جمالِ خداوندی کا نظارہ ممکن ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے لیکن اس کی تجلی کی جھلک اُس کی آیات میں دیکھ سکتے ہو۔ آیات دو قسم کی ہیں ایک تو آیات قرآنی اور دوسرے آیات فطرت جو ارض وسما پیش کرتے ہیں۔ دونوں قسم کی آیات میں ایک صفت مشترک ہے کہ دونوں خدا کی طرف متوجہ کرتے اور اس کی تجلی کو منعکس کرتے ہیں۔ فطرت خدا کی جلوہ گاہ ہے اسلئے مظاہر فطرت کو آیات کا درجہ دیا ہے اور قرآن میں انسان کو بار بار ان کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اور جو لوگ ان سے بے اعتنائی کرتے ہیں انہیں ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ
(س۱۲ آیت ۱۰۵)

(خدا کی کتنی نشانیاں ارض وسما میں تمہارے سامنے ہیں اور تم ان سے روگردانی کرتے ہو۔)

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ. (س ۴۵ آیت ۳)

(حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لئے)

صوفی ان آیات فطرت میں خدا کی جھلک دیکھتا ہے اور انہیں خدا سے قربت کا ذریعہ بناتا ہے۔ حسن فطرت میں حسن ازل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر حسین منظر میں اسے تجلی یزدانی نظر آتی ہے۔

مگر تو شانہ زدی زلفِ عنبر افشاں را
کہ باد غالیہ ساگشت وخاک عنبر بوست (حافظ)

صوفیانہ ذوق محض جمالیاتی ذوق نہیں اس میں لاہوتی ذوق کے طاقتور عنصر کا امتزاج ہے۔ وہ دونوں قسم کے ذوق سے مرکب ہے۔ صوفی کی نظر میں آیات فطرت کا مشاہدہ اور ان سے کیف اندازی وہ لازمی زینہ ہے جسے طئے کئے بغیر وہ آخرت میں جمال خداوندی کا مشاہدہ نہیں کر سکے گا۔ ایک قدیم صوفی کا شعر اس نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔

امروز ندیدی تو اگر روئے صنم را
فردا بقیامت رخِ جاناں چہ شناسی

صنم تجلی یزدانی کا وہ عکس ہے جو آیات فطرت میں نظر آتا ہے۔ غالب کہتے ہیں

ہمچو راز ے کہ بہ مستی ز دِل آید بیروں
در بہاراں ہمہ بوید وصبامی آید

ایک انگریز ادیب نے کہا ہے۔

In the tiniest leaf there is enough , more than enough to satisfy all our hunger.

اسلام کے متعلق اقبال نے اپنی نظم ونثر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں اسلام کے دو رخ ہیں جو قرآن میں پیش کئے گئے ہیں۔ پہلا رخ ابدی ہے جو زمان ومکان سے ماورا ہے اور اقتدارِ کلی کا حامل ہے۔ اس میں ترمیم اور کمی وبیشی کا کسی انسانی فرد یا جماعت کو اختیار نہیں۔ اسی رخ کے متعلق قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ

"مصدقا لما بین یدیه" ہے

اس رخ کو قرآن میں دین قیم کہا گیا ہے۔

مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّیْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَاؤُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ. اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ. اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاهُ. ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (س ۱۲ آیت ۴۰)

(تم لوگ تو اسے چھوڑ کر بس چند ناموں کی عبادت کرتے ہو، جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے کوئی بھی دلیل اس پر نہیں اتاری ہے حکم اور حکومت صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ اسی نے حکم دیا کہ بجز اس کے کسی کی پرستش نہ کرو، یہی دینِ قیم ہے۔ لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔ (س ۱۲، آیت ۴۰)

خدا کے سوا جن علتوں سے تم تخلیق و تنظیم کائنات منسوب کرتے ہیں۔ وہ سب تمہارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ جنہیں حقیقت کائنات سے کوئی تعلق نہیں۔

انرجی، Dialectic...... Elan vital ....cosmic Evolution.......

یہ توجیہی تصورات، انسانی ذہن کی تخلیق ہیں اور حقیقت سے معرا۔ جس نظام فکر میں ان کی تشکیل کی گئی ہے۔ ان کی قدر و قیمت اسی کی حد تک ہے۔ صرف خدا حقیقت مطلقہ ہے۔ صرف اس کی عبادت کرو۔ یہی دین قیم ہے۔ اور یہی اسلام کا ابدی رخ ہے۔ اسلام کا دوسرا رخ وہ ہے جو تاریخی متن میں پیش کیا گیا ہے۔ اور ایک مخصوص زمانہ کے سماجی رسم و رواج معاشی و معاشرتی حالات سے متاثر ہے۔ اس رخ کا اقتدار ابدی رخ سے ماخوذ ہے اور اس کے تابع۔ اس میں ابدی رخ کو زمان و مکان کی قیود میں پیش کیا گیا ہے۔ اور تاریخی واسطہ ہے۔ ملت اسلامیہ کے دوسرے رخ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ملت کی تنظیم و بقا کا اسی پر انحصار ہے مگر ابدی رخ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا اور اس سرچشمۂ حیات سے توانائی حاصل کرتے رہنا نہ صرف ملت کے بقا بلکہ اس کے مسلسل ارتقاء کا ضامن ہے۔ ابدی رخ کی روشنی میں ہم ثانوی رخ کو بدلتے ہوئے حالات سے مطابق کر سکتے اور اس کی قوت محرکہ کو بلاکم و کاست برقرار رکھ سکتے ہیں۔ دونوں رخوں میں امتیاز کرنے سے ہی ہم بعض استوار دینیاتی مسائل کو بھی حل کر سکتے ہیں۔ بعض دینیاتی حلقوں میں یہ خیال ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں ناسخ ہیں اور جو ان سے اختلاف رکھتی ہیں وہ منسوخ ہیں۔ قرآن پاک کی سالمیت پر جو اعتقاد رکھتے ہیں وہ کسی آیت کریمہ کو منسوخ نہیں تسلیم کر سکتے۔

بے شک ارشاد خداوندی ہے کہ بعض آیات منسوخ کردی گئیں اور بھلادی گئیں مگر یہ آیات

قرآن میں نہیں ہیں جو آیات بھلا دی گئی ہیں وہ کیسے موجود ہو سکتی ہیں۔ جن آیات میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ بعض آیات اسلام کے ابدی رخ سے متعلق ہیں اور بعض اس کی تاریخی رخ سے دونوں اپنے اپنے متن میں کامل جواز رکھتی ہیں اور ہمارے لئے واجب التعمیل ہیں۔

مگر یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کہ ان آیات کا تخاطب تمام انسانوں سے ہے یا صرف ملت اسلامیہ سے۔ جو آیات اسلام کے ابدی رخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ عالمگیر نوعیت کی ہیں۔ اور وسیع ترین عمومیت کی حامل۔ یہ ہر انسان کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ ملت سے مخصوص آیات کی روشنی میں ان کی اہمیت گھٹانا یا ان کی تجدید کرنا اسلام کی مرکزی تعلیم سے انحراف ہے۔ ان آیات میں نجات و مغفرت کی لازمی شرائط پیش کر دی گئی ہیں۔ اور جو انسان ان کی تکمیل کرے نجات کا مستحق قرار دیا گیا ہے البتہ روحانی ارتقاء کی اعلیٰ تر منزلوں تک رسائی کے لئے ملت سے مخصوص آیات سے موثر امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ملت سے رابطہ مستحکم رکھے اور وہی عمل کرے جس سے ملت کے استحکام کو تقویت ہو اور جو اس کے لئے تحفظ اور ترقی میں ممد و معاون ہو۔ اب چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جو ابدی رخ کی آئینہ دار ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ. وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا. (س ۴ آیت ۱۷۵)

(جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اسے انہوں نے مضبوط پکڑا انہیں وہ ضرور اپنی رحمت و فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنے تک سیدھی راہ دکھا دے گا)۔

۲. فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ (س ۲۲ آیت. ۵۰)

(پھر جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔)

۳. وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُوْنَ (س ۲۷ آیت ۷۳)

(حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے)

۴. وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ (س ۲۹ آیت ۴۶)

(ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔)

۵. وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى، وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (س ۳۱ آیت ۲۲)

(جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کردے اور عملاً وہ نیک ہو اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔)

۶. مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (س ۴۱ آیت ۴۶)

(جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے لئے ہی اچھا کرے گا۔ جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔ اور تیرا رب بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔)

۷. شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (س ۴۲ آیت ۱۳)

(اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔)

۸. اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (س ۵ آیت ۶۹)

(بے شک جو لوگ ایمان لا چکے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور صابی و نصرانی غرض جو بھی اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک عمل بھی کرے سو ایسوں کو نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

ان روح پرور آیات سے جو اتنی واضح اور شفاف ہیں کہ ان کی ایک ہی تعبیر ممکن ہے۔ اس کی دو خصوصیات مترشح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام تمام انسانوں کے لئے کشادہ دامن ہے۔ دوسرے وہ ارتقائے انسانیت کے لئے زبردست قوت محرکہ فراہم کرتا ہے اقبال کو یہ خصوصیات بے حد عزیز تھیں اور کوئی اقدام جو ان کی تقلیل یا تحدید کی سمت ہو ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ دینیات کے مخالف نہیں تھے بلکہ اسے آئین ملت کا محافظ اور نگہبان سمجھتے تھے اور یقین تھا کہ بغیر آئین سے وابستگی کے نظام ملت برقرار نہیں رہ سکتا۔

ملت را رفت چوں آئین زدست
مثلِ خاک اجزائے اُو از ھم شکست (اقبالؔ)

انہیں دینیات پر اس وقت اعتراض ہوتا ہے جب اس پر اصرار مناسب حد سے تجاوز کر جائے اور اسلام کی کشادہ دامنی میں کمی اور اس کی قوت محرکہ میں کاستگی کا باعث ہو۔ دینیات، دین

کے سمندر کو کوزہ میں سمونے کی کوشش کرتی ہے۔ کوزہ بھی کارآمد ہے گھر میں تشنگی رفع کرنے ہم کوزہ سے ہی کام لے سکتے ہیں۔ سمندر کو دعوت نہیں دے سکتے سمندر کو صرف منصور دعوت دے سکتا ہے۔ غلطی اس وقت ہوتی ہے کہ جب ہم کوزہ کو سمندر سمجھ لیں اور اپنے میدان نظر کو اسی تک محدود کردیں۔ روح انسانی کی بنیادی تشنگی کی حقیقی تشفی سمندر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے لئے دین سے مسلسل ربط قائم رکھنا اور اس کی روشنی میں دینیات میں ضروری ترمیم واصلاح کرتے رہنا ضروری ہے۔ دینیات ایک منجمد ضابطہ ہے اور دین ایک سیل رواں۔

سیلِ رواں کے ساتھ رہ کر ہی انسان نئی منزلیں طئے کرسکتا ہے اور وجود کی بلند تر سطح پر رسائی حاصل کرسکتا ہے۔ قرآن کا وعدہ ہے کہ۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (س ۸۴ آیت ۱۹)

(تم کو ضرور درجہ بہ درجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرتے چلے جانا ہے۔)

یہ وعدہ اِس زندگی کے لئے بھی ہے اور حیات بعد الممات کے لئے بھی۔

قرآن میں انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ تسلیم ورضا کو اپنا شعار بنائے۔ انگریز ادیب سمرسٹ مام نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی طویل زندگی سے صرف ایک سبق سیکھا ہے اور وہ Resignation یا تسلیم کا ہے۔ لیکن محض تسلیم، انفعالیت کو تقویت دیتی اور عمل کی تحریک مہیا نہیں کرتی۔ قرآن نے اس خامی کو دور کردیا ہے۔ اور تسلیم پر ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے کہ صرف تسلیم کافی نہیں اس کے ساتھ دوسرے انسانوں کی بھلائی اور امداد میں بھی سرگرم رہنا چاہئے۔ اقبال بھی خودی کی ترقی اور تکمیل کے لئے دونوں پر زور دیتے ہیں۔ انسان کے دو فرض ہیں۔ ایک تو وہ ان حالات وواقعات پر جو اس کے قابو سے باہر ہیں۔ صابر وشاکر رہے اور دوسرے اپنی قوتوں کو از دیادِ خیر اور فلاح انسانی کیلئے استعمال کرتا رہے۔ یہی عمل صالح ہے جو وسیلۂ نجات ہے۔

☆☆☆

پروفیسر عالم خوندمیری
سابق صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

جاوید نامہ۔فکری پس منظر

اقبال کے شعری مجموعوں پر ادبی اور فکری دونوں اعتبارات سے بحث کی جاسکتی ہے اور ان کا محاکمہ بھی کیا جاسکتا ہے۔لیکن ان دو معیارات میں توازن کو قائم اور برقرار رکھنا آسان نہیں۔مثلاً اسرار اور رموز، فکری اعتبار سے اقبال کی انتہائی اہم تصانیف ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ادبی اعتبار سے یہ تصانیف زبور یا لالہ طور کا مقابلہ کرسکتی ہیں۔اقبال کے ناقدین اور شارحین نے اقبال کی فکر کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ بہت کم لالہ طور کی ادبی اور ساتھ ہی فکری اہمیت کو اس کا مستحق مقام عطا کیا۔زبور میں فکری ہم آہنگی شاید نمایاں نہ ہو لیکن اس کی گہری معروضیت اور غزل کی ہیئت، زبور کو ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔ پیامِ مشرق کے اکثر حصوں میں اقبال کی اعلیٰ شاعرانہ رومانویت اس تصنیف کو اقبال کی دوسری شعری تصانیف سے بڑی حد تک ممتاز کرتی ہے یہی حال اقبال کے اردو شعری مجموعوں کا ہے۔ بانگ درا میں اقبال جہاں شعری خطابت کے اعلیٰ ترین مدارج کو چھو لیتے ہیں وہیں فکری اعتبار سے تغیر، تبدل اور انقلابیت کے عناصر بانگ درا کی تقریباً تمام شعری تخلیقات میں ابھر آتے ہیں۔ باگ درا کی نظموں میں یہ خودی کا پیام نمایاں نہیں۔لیکن تبدیلی اور انقلاب کے علائم اپنی پوری طاقت کے ساتھ نظر آتے ہیں اور پھر ان کی فکر کی اقطابیت (Polarity) پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں بال جبریل کا مرکزی تصور خودی ہے ، وہیں ضرب کلیم میں طاقت اور جبروت (Power) کے عناصر نمایاں ہیں۔اسی لئے اقبال کے مکمل عرفان کے لئے کسی بھی شعری مجموعے یا تصنیف کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان تمام شعری مجموعوں میں اسرار ورموز اور جاوید نامہ اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں اقبال نے اپنے فلسفیانہ مسلک (یا مسالک) کو ایک فکری تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔لیکن اسرار ورموز اور جاوید نامہ کے درمیان صرف زمانی فصل نہیں ہے بلکہ اس دوران اقبال نے ایک طویل فکری سفر بھی طئے کیا

ہے۔ اسرار ورموز اور جاوید نامے کی منزلیں بھی الگ ہیں اور شاعر کے نقاطِ نظر بھی جدا۔ اسرار نے یقیناً اپنے پڑھنے والوں کو چونکا دیا جس کی بڑی وجہ اقبال کا بُت شکنی کا رجحان تھا اور پھر ان کی نئی لفظیات، خودی کو بلند کرنا، یقیناً ایک کارِ نادر تھا۔ شاید اقبال، نطشے کی طرح، تقلیبِ اقدار (transvaluation of values) کی جانب مائل تھے۔ فکری اعتبار سے بھی اسرار میں نطشے کا اثر نمایاں ہے۔ ذرا گہری نظر سے لائبنز اور پھر فشٹے کے اثرات کا بھی انداز ہوتا ہے۔ اسرار میں ان کی فکر یقیناً زماں بردوش ہے۔ لیکن خودی اور زمان کا تناؤ۔ Tenision بھی نمایاں نہیں۔ ان کا حیاتیاتی نقطۂ نظر بھی برگسوں کے مقابلہ مں نطشے سے قریب تر ہے۔ خود وجود کی ماہیت کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ مثلاً جہاں وہ کہتے ہیں کہ زندگی خودی کے اسرار سے تعلق رکھتی ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
نقطۂ نورے کہ نام اُو خودی است
زیرِ خاک ماشرارِ زندگی است

تو یہ واضح نہیں ہوتا کہ خود خودی کی نوعیت کیا ہے۔ اس خودی سے مراد خودی مطلق ہے یا انسانی خودی۔ اسرار کی منزل پر اقبال' وحدیت Monism سے اس حد تک گریزاں ہیں کہ وہ اس خودی سے خودی مطلق مراد نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن فطری نقطۂ نظر سے، مشکل یہ ہے کہ خودی اور خدا کا ربط ایک سوال بن جاتا ہے۔ نطشے کے سامنے تو یہ مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن اقبال کیلئے یقیناً یہ ایک مسئلہ تھا۔ نطشے کی طرح اقبال بھی اسرار میں یہ پیام دیتے ہیں کہ خیر وشر کا معیار بھی خودی اور اس کا استحکام ہے۔ اس طرح خودی، بنیادی طور پر ماورائے خیر وشر بن جاتی ہے۔ اِس مشکل کو انہوں نے رموز میں حل کرنے کی کوش کی لیکن رموز کا پیش کردہ، حل سیاسی، عمرانی ہے۔ مذہبی اور مابعد الطبیعاتی نہیں۔ اس مشکل کو صرف صوفیانہ شعور حل کرسکتا تھا اور اقبال، خود اپنے اس امکانی شعور کے خلاف برسر جنگ تھے۔ ان کی تخلیقی خودی جس پر ابھی تک حیاتیاتی اثر تھا۔ خود اپنی استعداد سے لاعلم تو نہیں تھی لیکن اس کے خلاف شاید برسر پیکار تھی۔ اسرار کا ایک اور مقام جو اس نظم کی فکری ساخت میں بذات خود اہم ہے۔ ایک اہم اخلاقیاتی اور مذہبی مشکل سے ہمیں دو چار کرتا ہے۔

نیابت الٰہی کے مرحلہ پر جہاں اقبال اپنے نصب العینی انسان کا ایک، سرخوشی، اور سرمستی، کے عالم میں ذکر کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایک انتظاری، کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ مثلا

ہستی مکنونِ اُو راز حیات
نغمۂ نشیندہ ساز حیات
طبع مضمون بندِ فطرت خوں شود
تا دوبیتِ ذات او موزون شود
خفتہ در خاکستر امروز ما
شعلۂ فردائے عالم سوز ما
غنچہ ما گلستان در دامن است
چشم ما از صبح فردار وشن است
اے سوار اشہب دوران بیا
اے فروغ دیدۂ امکان بیا
رونقِ ہنگامہ ایجاد شو
در سواد دیدہ ہا آباد شو!
نوع انسان مزرع وت وحاصلتے
کاروان زندگی را منزلے

یہ انتظاری کیفیت، ہمیں نطشے کی یاد دلاتی ہے جس طرح نطشے اپنے انسان برتر کا منتظر ہے۔ اسی جوش وخروش کی حالت میں اقبال بھی مستقبل کے نائب الٰہی کا انتظار کرتے ہیں۔ اقبال نے یقیناً اپنے اور نطشے کے نصب العینی انسان کے فرق کو واضح الفاظ میں پیش کیا ہے۔ (بحوالہ مکتوبِ اقبال بنام نکلسن) لیکن اسرار کے اشعار میں اس وضاحت کا عکس نظر نہیں آتا۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اگر یہ انسانِ برتر، اقبال نے اس لفظ کا کہیں استعمال نہیں کیا ہے۔ مستقبلی ہے تو پھر ذاتِ رسول اللہؐ سے اس کا ربط کیا ہے۔ صوفیا اور اقبال کے ''انسان کامل'' کا یہ فرق انتہائی اہم ہے اور اسرار میں اس ربط پر روشنی نہیں پڑتی۔ رموز میں اقبال نے اسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا۔ عمرانی سیاسی سطح پر اور اسی لئے اقبال کی فکر بلند، رموز

میں شریعت کی منزل سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اقبال کی فکر نے بتدریج اس گتھی کو اس وقت سلجھایا جب وہ انسان برتر کے پُرشکوہ تصور سے گزر کر، مردمومن کے اخلاقی اور اعلیٰ تر مذہبی صوفیانہ، تصور پر پہونچے، اسرار کے نصب العینی، انسان اور ذات رسول اللہ میں ربط کا پہچاننا جتنا مشکل تھا۔ مرد مومن اور ذات رسولؐ میں اتنا مشکل نہیں۔

اسرار جہاں اقبال کی شاعرانہ فکر کا نقطۂ آغاز ہے۔ جاوید نامہ، اقبال کی فکری منزل ہے۔ اس منزل تک پہونچتے پہونچتے اقبال نے کئی فکری گتھیوں کو سلجھانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کی مشکل پسند فکر، کسی تناؤ کے آخری حل کو قبول نہیں کرتی۔ اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جاوید نامہ اور خطبات اقبال، (اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید) میں زمانی قربت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تقریباً ایک ہی زمانے میں اقبال نے خطبات اور جاوید نامہ کے پلان بنائے۔ یوں تو ایک عرصے سے، یہ دونوں منصوبے اقبال کے پیش نظر تھے لیکن ان کی تکمیل کیلئے عرصہ لگا۔ جہاں خطبات کیلئے اقبال نے مشرق اور خصوصا اسلامی مشرق اور مغرب کے افکار کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہیں انہوں نے انسانی شعور اور مذہبی صوفیانہ شعور کے درمیان ربط کی تلاش کیلئے اسلامی تصوف کے ادب پر بھی گہری نظر ڈالی۔ مثلا 19ء اور 20 کے زمانے میں، اقبال نے شاید ابن عربی کا راست مطالعہ نہیں کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو اقبال کے خطوط۔ سلیمان ندوی کے نام۔ اقبال نامہ) اور صوفیانہ وحدانی نقطۂ نظر کے بارے میں ان کی شدید مزاحمت برقرار تھی۔ لیکن خطبات اور جاوید نامہ تک پہونچتے پہونچتے، ان کی یہ مزاحمت ٹوٹی۔ اس لئے کہ اب جو سوال ان کے لئے اہم تھا۔ وہ مذہبی صوفیانہ شعور(Religio-mystical consciousness) کا تھا، اور اسی سوال کے ساتھ وجود کی ماہیت اور شعور سے اس کے ربط کا سوال بھی وابستہ تھا اور پھر وجود اور انسانی وجود کے باہمی ربط کے مسئلہ کو بھی سلجھانا تھا۔ ان سوالات کے جواب حاصل کرنے میں اقبال جہاں ایک طرف صوفیانہ مذہبی شعور کی مجموعی روایت سے قریب تر ہوجاتے ہیں۔ وہیں وہ اس روایت کی عصری فلسفیانہ اصطلاحوں میں تشریح بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس تشریح میں اعتذار کا پہلو نہیں بلکہ ایک تخلیقی ترکیبی سعی کارفرما نظر آتی ہے۔ شعور کے مدارج کا قدیم صوفیانہ تصور، جو عالمی صوفیانہ شعور کی مشترک روایت ہے ان کا رہنما بن جاتا ہے۔ اسی طرح وجود کے مدارج کا نقطۂ نظر، کثرتیت، فردیت، اور وحدیت کے بظاہر متصادم

نقاطِ نظر میں ہم آہنگی کا وسیلہ بن جاتا ہے اسی منزل پر، عجیب بات یہ ہے کہ اسلام کے وحدانی صوفی مفکر ابن عربیؒ اور سترھوین صدی کے جرمن فلسفی لائبنز میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ یہاں اس نکتہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ جہاں خالص وحدیت پسند نقطۂ نظر کثرت کے مسئلہ میں الجھ جاتا ہے، وہیں کثرتیت پسند (Pluralist) مسلک، وحدت کی گتھی کو سلجھا نہیں سکتا۔ ابن عربی کے وحدانی وجودی نقطۂ نظر کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے وحدت، کثرت اور فردیت کی سطحات کو ان کے تسلسل اور پھر امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے وجود کی وحدت کو قائم رکھا۔ اقبال نے خطبات میں اسی نوع کے وحدانی، وجودی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ یقیناً انا یا خودی کی وجودی برتری کے تصور پر اقبالؔ قائم ہیں لیکن خودی اور غیر خودی کے درمیان، بنیادی وجودی فرق کے وہ قائل نہیں رہتے۔ خدا بھی اب خودی مطلق کا دوسرا نام ہے اور کوئی شئے۔ خودی مطلق کے باہر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ صوفیانہ مذہبی تجربہ اسی وجود کے وحدانی شعور کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ وجود کے مدارج اور شعور کے مدارج میں ایک ہم آہنگی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وجود کی اعلیٰ ترین منزل اور شعور کا اعلیٰ ترین تجربہ، ایک ہی حقیقت کے دو رخ نظر آتے ہیں۔ اقبال کا استدلالی انداز مختلف ضرور ہے لیکن ان کے فکری نتائج اور ان کا مذہبی وجدان، اعلیٰ ترین مذہبی صوفیانہ روایت کا ایک تسلسل بن جاتے ہیں۔

جاوید نامہ کا مابعد الطبیعاتی اور فکری پس منظر، یہی وجدانی نقطۂ نظر ہے جس کی تشریح ابن عربیؒ کے نقطۂ نظر سے بھی کی جاسکتی ہے اور شہودی نقطۂ نظر سے بھی۔ بشرطیکہ ہم ان تمام فکری مساعی کو پیش نظر رکھیں جو ان دو نقاط نظر میں، اندرونی اتحاد کی جویا رہی ہیں۔ یہاں اقبال ہندوستان کے صوفی شاعر خواجہ میر درد سے قریب تر ہیں۔ جو ابن عربیؒ سے دور نہیں۔

جاوید نامہ کی پہلی پر ہی جہاں پیر رومی نمودار ہوتے ہیں۔ اقبال کا یہ وجدانی وجودی نقطۂ نظر آشکار ہو جاتا ہے۔

گفتمش، موجود و ناموجود چیست؟
معنی محمود و نامحمود چیست
گفت، موجود آنکہ می خواہد نمود
آشکارائی تقاضائے وجود

زندگی خود را بخویش آراستن
بروجودِ خود شہادت خواستن
انجمن روز الست آرستند
بروجود خود شہادت خواستند

ان اشعار کے بعد کے شعر، وجود کے مدارج اور ان کے درمیان وجودی ربط کی تشریح کرتے ہیں اور اسلامی تصوف کا ایک اہم عنصر، جو تقریباً تمام سامی مذاہب کے صوفیانہ مسالک میں مشترک ہے۔ نمایاں ہوتا ہے اور وہ ہے شہادت یا Testimony کا وجود کی ہر منزل، اعلیٰ ترین منزل کی شہادت یا Testimony بن جاتی ہے۔

زندۂ یا مردۂ جاں بہ لب
از سہ شاہد، کن شہادت را طلب
شاہد اول، شعور خویشتن
خویش را دیدن بہ نورِ خویشتن
شاہد ثانی، شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بہ نورِ دیگرے
شاہد ثالث ، شعورِ ذات حق
خویش را دیدن بہ نورِ ذات حق

اسی مقام پر اقبال کا سب سے طاقتور شعری مذہبی ابھرتا ہے جو جاوید نامہ کا بنیادی اور مرکزی محرک ہے۔ یعنی تجلی ذات، یہی آرزو ہے جس نے اقبال کو اکسایا اور یہی تجربہ تھا جس کو ہم ذات مصطفویؐ کی معراج کے نام سے یاد کرتے ہیں، جاوید نامہ کا محرک یہی تجربہ ہے اور اسی تجربے کی لگن۔ جاوید نامہ کے آغاز ہی پر مناجات میں ہم اس آرزو کے شاہد بنتے ہیں۔

بے تجلی ، زندگی رنجوری است
عقل مہجوری ودیں مجبوری است
این جہاں کوہ و دشت وبحر وبر
ما 'نظر' خواہم و اُو گوید 'خبر'

نظر کی تلاش اور محض خبر سے بیزاری، جاوید نامہ کا طاقتور ترین محرک ہے اور یہیں ان کا انسان اور انسانی وجود کے بارے میں عارفانہ نقطۂ نظر واضح ہوتا ہے مثلاً اسرار خودی میں۔ نائب کا تصور، اس عارفانہ منزل کی صرف ابتدائی شکل ہے۔ نیابت کا پچھلا تصور، بڑی حد تک عمرانی۔ سیاسی ہے۔ اور نائب کا اہم فرض اسلامی نظام کا قیام ہے۔ اب انسان کی منزل، کشفِ حقیقت ہے اور خبر سے نظر تک پہنچنا ہے۔ انسان کا فرض صرف سیاسی عمرانی مفہوم میں نائب بننا نہیں ہے بلکہ حقیقت مطلق سے کشف اور نظر کے ذریعہ اپنے آپ کو مربوط کرنا ہے۔ اس لئے اقبال کی مناجات ہے۔

منزلے بخش این دلِ آوارہ را
باز دہ با ماہ ایں ماہ پارہ را
گرچہ از خاکم نروید جز کلام
حرفِ مہجوری نمی گردد تمام
زیرِ گردوں خویش را یابم غریب
زآنسوئے گردوں بگو اِنّی قَرِیب

غربت کا احسان اور تمنائے قربت، ایک لاینحل اور مستقل تناؤ کو پیش نہیں کرتے یہ زیست کا تناؤ ہے۔ مطلق وجودی تناؤ نہیں ہے۔ یعنی ایک اعلیٰ تر شعوری تجربے میں زیست کا یہ تناؤ حل ہوسکتا ہے اور وجود کے اقطاب، ایک ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے ہیں۔ وجود کے اقطاب وجود کے ضدّینی پہلو نہیں، بلکہ صرف زیست کا تضاد ہیں جو شعور کی اعلیٰ تر سطح پر حل ہوسکتا ہے۔ واقعی زیست اور وجود امکانی استعداد اور استعداد کی تکمیل کے پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ جہاں تک انسانی وجود کا تعلق ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ کے اس حصے میں جہاں انہوں نے خلافتِ آدم (محکماتِ عالم قرآنی، خلافت آدم فلکِ عطارد، جمال الدین افغانی) کی تشریح کی ہے، اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ ہر چند کہ کلام، افغانی کی زبان سے سرزد ہوا ہے لیکن افکار کا جہاں تک تعلق ہے، اقبال نے عارفانہ صوفیانہ نقطۂ نظر کی وکالت کی ہے جہاں وہ کہتے ہیں۔

ابن آدم سرّے از اسرارِ عشق

ابن عربی کی یاد آتی ہے جب انہوں نے حسین بن منصور الحلاج کے کلمہ انا الحق کو انا سر الحق میں تبدیل کیا تھا۔ اقبال کے پاس عشق اور حق مرادف ہیں۔ ابن عربی فصِ آدم میں حقیقت آدم کی

تشریح یوں فرماتے ہیں۔ لما شاء الحق سبحانه من حیث اسمائه الحسنی التی لا یبلغها الاحصاء ، ان یریٰ اعیانها، وان شئت قلت ان یری عینیه فی کون جامع یحصر الامر کله لکونه متصفا، بالوجود، ویظهر به سره الیه۔ اسی طرح انسانِ کامل کی تشریح یوں کرتے ہیں۔جمیع الاسماء الالهیة وحقائق (فصوص الحکم)

جاوید نامہ کا تفصیلی مطالعہ، اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب اقبال کا بشریاتی نقطۂ نظر بعض عمرانی۔ سیاسی نہیں رہا بلکہ عارفانہ ہے اور عمرانی سیاسی نتائج، اسی عارفانہ نقطۂ نظر سے برآمد ہوتے ہیں عرفانِ ذات اب اقبال کیلئے معراج انسانی ہے اور اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

مرد مومن در نسازد باصفات
مصطفیٰؐ راضی نشد الّا بذات
چیست معراج آرزوئے شاہدے
امتحانے روبرئے شاہدے

اسی تجربے کی اپنی زندگی میں بازیافت جاوید نامہ کا روحانی محرک ہے۔ یہ محض شاعرانہ سیر افلاک نہیں بلکہ ایک ایسی تمنا کا اظہار ہے جو ایمان کی تکمیل کی ضامن ہے۔اسی لئے جاوید نامہ اگر تجربہ کے حصول کی داستان نہیں تو کم از کم تجربے کے اشتیاق کی اس منزل کی تصویر ہے جہاں اشتیاق اور تکمیل میں فاصلہ کم سے کم رہ جاتا ہے۔

اسی آرزو کے اظہار میں اقبال نے معراج کے اسرار پر اہم بحث کی ہے اور یہ حصہ اسلامی ادب کا ایک اہم ترین جز بن جاتا ہے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ وجود اور شعور کا ربط، اقبال کا ایک اہم فکری محرک ہے اور اسی روشنی میں انہوں نے معراج کی تشریح کی ہے۔ اسلامی ادب میں معراج کی بحث بڑی معرکۃ الآراء رہی ہے۔ تجربہ روحانی تھا کہ جسمانی یا محض رویاء۔ قدیم حکماء نے افلاک کے رمز براق کی علامت اور شق صدر کو لغوی اور لفظی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی اور اسی لئے یہ بحث، فلکیاتی اور حقیقت جسم کی اصطلاحوں کا شکار ہوگئی لیکن عارفانہ نظر جو جسم اور روح کے اعتباری فرق کو ایک اعلیٰ تر حقیقت میں حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ان علائم کو حقائق کا مرتبہ نہیں دیتی بلکہ انسانی فہم کی ایک ایسی منزل قرار دیتی ہے جہاں فہم مادی اور مکانی زبان میں اپنا اظہار کرتی ہے خود قرآنی زبان میں۔ ''سبحان الذی اسریٰ بعبده'' میں ''اسریٰ بعبدہ'' اہم اور

معنیٰ خیز اظہار ہے۔ یہاں ''ب'' کا حرف جہاں معیت کے رمز کا پاسباں ہے وہیں جسم اور روح کی تفریق اور تضاد کو بے معنی بنا دیتا ہے اور آیۂ تسخیر کو ایک نیا مفہوم عطا کرتا ہے۔

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست؟
این سپہر نیلگوں حیرانِ کیست
رازدانِ علم الاسماء کہ بود
مستِ آں ساقی و آں صہبا کہ بود
برگزیدی، از ہمہ عالم کرا
کردی از رازِ داروں محرم کرا

اسی مقام پر ابن عربی کی ایک عبارت بھی غور وفکر کا موقعہ فراہم کرتی ہے جہاں وہ ''**و سخر لکم مافی السموات وما فی الارض جمیعا منه.** کے بارے میں فرماتے ہیں۔

فکل مافی العالم تحت تسخیر الانسان ، علم ذالك من علمه وهو الانسان الکامل وجهل ذالك من جهله وهو الانسان الحیوان. (فصوص الحکم)

اس مقام پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہاں تسخیر کا مطلب کائنات کی مادی تسخیر نہیں ہے بلکہ روحانی تسخیر ہے جس عمل میں انسان کامل، اپنی روحانی قوت سے جو اس کو اپنی استعدادات کی تکمیل سے حاصل ہوتی ہے۔ کائنات کو مسخر کرتا ہے یہی معراج کی روح اور اس کا روحانی مفہوم ہے جہاں جسم اور روح کی دوئی ختم ہوتی ہے اور شخصیت اس مقام پر پہنچتی ہے جہاں عین تجلی پر بھی۔ ''**ما زاغ البصر وما طغیٰ**'' کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے معراج محض جسمانی ہے نہ روحانی بلکہ شخصیت کی مکمل ترین توسیع ، ''**مازاغ البصر وما طغیٰ**'' کا مفہوم شخصیت کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا اور شخصیت صرف مادہ ہے اور نہ روح۔ اسی مفہوم کو اقبال نے اس طرح پیش کیا ہے۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب وشوق
وا رہاند جذب وشوق از تحت وفوق

این بدن با جانِ ماانباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

پہلے شعر میں شعور، دونوں مصرعوں میں مشترک ہے۔لیکن پہلا شعور جہاں نزدودور کا امتیاز ہے ہمارا معمول کا وقوفی شعور ہے جو زماں بستہ اور مکاں بستہ ہے لیکن شعور میں انقلاب اور توسیع کے بعد وہ منزل آتی ہے جہاں نہ صرف مکانی بلکہ زمانی امتیازات بھی رفع ہو جاتے ہیں۔شعور ایک سرمدی حال کا لطف حاصل کرتا ہے یہ وہ منزل ہے جہاں شعور وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اور شعور، شعور سرمدی کی منزل پر مکمل سرور کا حامل ہوتا ہے۔یہی النفس المطمئنہ ہے۔

اب جب زمانی اور مکانی امتیازات شعور کے اس انقلابی لمحے میں رفع ہو جاتے ہیں تو انسانی شخصیت خود انقلاب آفریں بن جاتی ہے۔یہی وہ راز ہے کہ واقعہ معراج کے بعد ہجرت واقع ہوئی اور رسول عربیؐ نے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔یہی خلوت اور جلوت کا تخلیقی مفہوم ہے نبیؐ کے تجربے میں خلوت اور جلوت میں ایک توازن ہوتا ہے جہاں ''لی مع اللہ وقت'' ہے وہیں انسان کی انجمن بھی ہے۔اسی کو ایک دوسری جگہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

خودی کو خلوتوں میں کبریائی
خودی کو جلوتوں میں مصطفائی

اقبال نے اپنے ایک خطبے میں بھی نبوت اور ولایت کے اس فرق کو پیش کیا ہے اور ذرا مبالغے کے ساتھ ان کے نزدیک جہاں تک تجربہ کا تعلق ہے نبوت اور ولایت میں بنیادی فرق نہیں، لیکن نبیؐ کی شخصیت عزلت اور مراجعت کے آہنگ کی مظہر ہوتی، جہاں ولی عزلت کی جانب مائل نظر آتا ہے۔ جاوید نامہ میں زرتشت کو ابلیس نے اسی ولایت اور خلوت کی ترغیب، Temptation دی تھی تاکہ وہ انسانی انجمن سے یعنی معرکۂ خیر وشر سے اپنے آپ کو دور کرلیں۔

جاوید نامہ کی ابتداء میں زروان کا ظہور ایک اہم ڈرامائی منصب کی تکمیل کرتا ہے جہاں ''مشت خاکے مانع پرواز نیست''، کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔اس لمحہ زمان ومکان کا زرتشتی فرشتہ اپنی پورے جلال کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔بعض ناقدوں کی نظر میں زروان کا ظہور، اقبال کی فکری بدعت کا مظہر ہے۔لیکن ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ اقبال نے شعر کے روپ میں اپنے روحانی تجربے کی ترسیل کی ہے اور زرواں کا ظہور ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کرتا ہے اقبال کا محرک زروان

کی عظمت کو نہیں بلکہ زرواں کی آخری شکست کو پیش کرتا ہے۔ زروان کی تقریر۔

گفت زروانم جہاں را قاہرم

ایک عجیب ہیبت اور شکوہ کا منظر فراہم کرتی ہے۔ لیکن زروان جہاں اپنی طاقت کا اعلان کرت اہے وہیں آخر میں ہار مان جاتا ہے۔

''لی مع اللہ'' ہر کرادر دل نشست
آن جواں مردے طلسمِ من شکست
گر تو خواہی من نباشم درمیاں
''لی مع اللہ'' باز خواں از عینِ جاں

اسی طلسم کی شکست اقبال کے نزدیک زادنِ نو ہے۔

زادنِ طفل از شکست اشکم است
زادنِ مرد از شکستِ عالم است
ہر دو زادن را ولیل آمد اذاں
آن بلب گویند و ایں از عینِ جاں
جانِ بیدارے چوزاید دربدن
لرزہ ہا افتددریں دیرِ کہن

یہی زادنِ نو ہے جو شخصیت کی معراج کی تمہید ہے اور شق صدر اسی کی ایک علامت ہے اسی زادنِ نو میں حیاتِ جاوداں کا راز ہے اور یہیں ہم جاوید نامہ میں اقبال کے ایک اہم محرک کا اشارہ پاتے ہیں۔ مناجات میں اقبال نے دعا کی تھی۔

آنیم من جاودانی کن مرا
از زمینی آسمانی کن مرا

جاوداں بننا یا بقا (Immortality) کا حصول اقبال کی ایک دیرینہ تمنا تھی۔ انہوں نے بقاء کے قدیم مروجہ مفہوم کو بہت پہلے رد کر دیا تھا۔ افکار پریشان Stray Reflections میں جو 1910 پر ختم ہوتے ہیں۔ انہوں نے شخصیت کی بقاء کے مسئلے پر اشارہ کیا تھا جو ان کے خطبے میں واضح ہوا۔ بقا ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔ اس بات کی انہوں نے تردید کی بلکہ یہ اعلان کیا کہ

جاودانیت یا بقاء ایک تمنا اور آرزو ہے جس کی تکمیل، ہر فرد کا نصیب نہیں۔ ان کے الفاظ میں ہم صرف بقا کے امیدوار ہیں۔

یہ خیال بظاہر حیرت انگیز نظر آتا ہے۔ لیکن یوں بالکل انوکھا نہیں۔ اسلامی فکری تاریخ میں پہلی بار ابونصر فارابی نے اس خیال کی وکالت کی تھی اور مغربی فکر میں اسپنوزا نے بھی اس کی حمایت کی تھی اقبال کی اس شدید آرزو کا راز یہی ہے کہ یہ ایک ایسی سعادت ہے جس کے حصول کے لئے انسانی کوشش بھی ضروری ہے۔ خطبات میں اقبال کا جواب یہ ہے کہ وہی جو اپنی شخصیت یا خودی کو مستحکم کرتے ہیں اور اپنے اصلی انا کو حاصل کرتے ہیں۔ بقاء کے مستحق قرار پاتے ہیں، لیکن جاوداں بننا یا بقاء حال کرنا، زمان و مکاں سے کامل نجات کا نام نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر اور مختلف زمانی، مکانی نظام سے دو چار ہونا ہے یہیں اقبال کا انفرادی نقطۂ نظر نمایاں ہوتا ہے اور زمان و مکان کے مختلف مداج یا مختلف عوالم کے سرّی پہلو کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ جاوداں بننے کی آرزو عالمی مذہبی شعور کا ایک خاصہ ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ قدیم آریائی ویدی ذہن میں یہ آرزو اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے ایک اپنشد کی دعا ہے۔

''غیر حقیقی سے حقیقی تک میری رہنمائی کر، اندھیرے سے نور تک مجھے لے چل۔ موت سے یا فنا سے بقا کا مجھے راستہ دکھلا۔''

اقبال کی دعا بھی کم و بیش یہی ہے اور اس دعا کی تکمیل بھی اس امر میں پنہاں ہے جو تمام عارفوں کی معراج نظر رہی ہے۔

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور ، اندر ضمیر خود نگر
روزہا روشن ز غوغائے حیات
نے ازان نورے کہ بینی در جہات
نورِ صبح از آفتاب داغدار
نورِ جاں پاک از غبار روزگار
نورِ جاں ' بے جادہ ہا اندر سفر
از شعاعِ مہر و مہ سیار تر

اسی طرح اپنشد میں ایک مقام ہے۔

' یہاں سورج نہیں چمکتا۔ اور نہ چاند نہ تارے، وہاں بجلیاں نہیں چمکتیں۔ آگ کا نور کہاں وہ خود (انا) روشن ہے اور چیزیں اسی نور سے روشن ہیں۔ یہی نور ساری دنیا کو منور کرتا ہے۔ '

The sun does not shine there , nor yet the moon and stars,

Nor do these lightnings shine there much less mere fire,

It self shines and all things shine in its reflected light,

Its light illuminates this whole world (Br-hadarnyaka up)

ہندوستانی عارف وشوامتر نے اسی روشنی کی تلاش کی تھی اور بقاء کی یہی تمنا اس کی روح کو گرماتی اور مضطرب کرتی رہی تھی۔ وہ ذات کے کھتری تھے لیکن اپنی ریاضت سے انہوں نے برہمن وعارف کا درجہ حاصل کیا اور جاودانی بن گئے۔ ایک روایت کی رو سے ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنے جسم کے ساتھ جاودانی بنیں۔ ان کی ریاضتیں قبول ہوئیں اور انہوں نے بقاء کا مقام حاصل کیا۔ یہی جذبہ، اقبال اور وشوامتر میں مشترک تھا اور شاید یہی سبب ہے کہ اپنے روحانی سفر میں ان کی پہلی ملاقات، وشوامتر (جہاں دوست) سے ہوئی ہے۔ اس غار کا جہاں عارف ہندی (جہاں دوست) مکیں ہیں۔ اقبال نے یوں نقشہ پیش کیا ہے جو مندرجہ بالا اپنیشد کے متن سے قریب تر ہے۔

تا نگہ را جلوہ باشد بے حجاب
صبح روشن بے طلوعِ آفتاب
وادی ہر سنگِ اُو زنّار بند
دیو سار از نخلہائے سربلند
در ہوائے اُو چومے ذوق وسرور
سایہ از تقبیلِ خاکش عینِ نور
نے زمینش را سپہر لاجورد
نے کنارش از شفقہا سرخ وزرد
نور در بند ظلام آنجا بنود
دودِ گردِ صبح وشام آنجا نبود

اس طرح عارف ہندی جہاں دوست سے ملاقات ہوتی ہے۔[۱۰] اسرار عالم وآدم پر اور حقیقت مرگ وحیات پر رومی زندہ رود (اقبال) اور جہاں دوست کی گفتگو ہوتی ہے جہاں دوست کے سوال اور زندہ رود کے جواب، ایک ایسے روحانی مکالمہ کی فضاء پیدا کرتے ہیں جو اس دنیا میں انسان کی روحانی نجات کی واحد ضامن ہے۔ اقبال نے اس مقام پر روحانی مکالمہ (Dialogue) کا ایک نیا محرک پیش کیا ہے اقبال کے جوابات سے جہاں دوست کا اتفاق ہے اس امر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ کہ جب نظر مذاہب کے ظاہر سے ان کے باطن کی طرف پلٹتی ہے۔ تو حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ اس مکالمہ کی روح۔ مذاہب کی روح کی شاہد ہے۔

گفت مرگ عقل؟ گفتم ترک فکر
گفت جاں؟ گفتم کہ رمز لا الٰہ
گفت آدم؟ ، گفتم کہ زاد از گردرہ
گفت جاں؟ گفتم کہ رمز لا الٰہ
گفت آدم؟ ، گفتم از اسراراوست
گفت عالم؟ گفتم ار خود روبرست
گفت ایں علم وہنر؟ ، گفتم کہ پوست
گفت حجت چیست ، گفتم روئے دوست
گفت دین عامیاں؟ ، گفتم شنید
گفت دین عارفاں؟ ، گفتم کہ دید
از کلامم لذت جانش فزود
نکتہ ہائے دل نشین برمن کشود

فلک قمر سے اقبال کا روحانی سفر شروع ہوتا ہے اور ان کی مذہبی صوفیانہ فکر کے یہ عناصر جن کا اس مضمون میں ذکر کیا گیا ہے۔ بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ نمایاں ہوتے ہیں۔ اس تصنیف کی ادبی حیثیت تو مسلم ہے لیکن اس امر میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبال ایک روحانی عالم سے گزرے اور ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوئے جو ہر دور میں عارفوں کا منتہائے نظر رہا ہے۔

حاشیہ:

۱ پچھلے چند برسوں میں اقبال کے ایک ممتاز ماہر جگن ناتھ آزاد نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ جہاں دوست' قدیم ہندی مذہبی ادب کے وشوامتر، نہیں ہیں بلکہ شیو جی ہیں۔ یہاں ان شواہد کے قطع نظر جو جہاں دوست، اور وشوامتر کی عینیت پر دلالت کرتے ہیں، اس بات کی جانب توجہ ضروری ہے کہ خود اقبال نے جہاں دوست کو وشوامتر ٹھہرایا ہے۔ گول میز کانفرنس کے دوران انڈیا سوسائٹی کے ایک علمی اجتماع میں جس کی صدارت سر فرانسیس ینگ ہزبنڈ نے کی تھی، اقبال نے اپنے کلام اور افکار کا جائزہ لیتے ہوئے، جب جاوید نامہ پر روشنی ڈالی تو کہا۔ ''میری تازہ تصنیف مطبع میں جا چکی ہے اور غالباً ایک دو مہینوں میں چھپ جائے گی۔'' یہ حقیقت میں ایشیاء کی ڈوائن کامیڈی ہے جیسے دانتے کی تصنیف یورپ کی ڈوائن کامیڈی ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر مختلف ستاروں کی سیر کرتا ہے اور اس میں مختلف مشاہیر کی روحوں سے باتیں ہوتی ہیں۔ پھر جنت میں جاتا ہے اور آخر میں خدا کے سامنے پہنچتا ہے۔ اس تصنیف میں دور حاضر کے تمام جماعتی، اقتصادی، مذہبی، اخلاقی اور سیاسی مسائل زیر بحث آ گئے ہیں۔ اس میں صرف دو شخصیتیں یورپ کی ہیں اول کچنر دوم نطشے باقی تمام شخصیتیں ایشیاء کی ہیں۔ دانتے نے اپنا رفیقِ سفر یا خضرِ طریق ورجل، کو بنایا تھا۔ میرے رفیق سفر یا خضرِ طریق۔ مولانا روم ہیں۔ میں اس تصنیف میں سے صرف ایک دو مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ مثلاً چاند میں ہندوستان کے مشہور صوفی وشوامتر سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام میں نے جاوید نامہ میں جہاں دوست رکھا ہے اس لئے کہ وشوامتر کے معنی جہاں دوست کے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سفر نامہ اقبال مرتبہ محمد حمزہ فاروقی، مکتبہ معیار کراچی ص ۶۱) اقبال کے اس توضیحی بیان کے بعد وشوامتر کے بارے میں مزید بحث لاحاصل ہے۔ اب رہا آزاد صاحب کی یہ بحث کہ اس شعر

موئے بر سر بستہ و عریاں بدن
گردِ اُو مارے سفیدے حلقہ زن

میں ''گردِ اُو مارے سفیدے حلقہ زن'' سے ذہن شیو جی کی طرف جاتا ہے۔ عرض یہ ہے کہ ہندی مذہبی علائم میں یہ تصویر سخت ریاضت کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ چونکہ اقبال کی ملاقات جہاں دوست سے فلک قمر پر ہتی ہے۔ اور ہندو دیو مالا کی رو سے شیو جی کے ماتھے پر ہلال ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مماثلت، محض اتفاقی ہے۔ اقبال کا

روحانی سفر فلکِ قمر سے شروع ہوتا ہے اور یہ بات معنیٰ خیز ہے کہ پہلے ہی مرحلے پر ان کی ملاقات عارفِ ہندی سے ہوتی ہے اور وہ ہندوستان کی بیداری پر روشنی ڈالتے ہیں۔

گفت ہنگام طلوعِ خاور است
آفتابِ تازہ اُو را دربراست
لعلہا از سنگِ رہ آید بروں
یوسفانِ اُو زِچہ آید بروں
رستخیزے درکنارش دیدہ ام
لرزہ اندر کوہسارش دیدۂ ام

یہاں ایک اہم علامتی پہلو یہ ہے کہ قمر زمین سے قریب تر ہے اور شاعر کا رشتہ ابھی زمین سے باقی ہے۔ ارضِ وطن زمین کی علامت ہے۔ پرواز کی پہلی منزل پر انسان، اپنی قریبی زمین کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہی ہے۔ (حاشیہ ختم) (اقبال ریویو، اکتوبر ۱۹۷۷ء)

☆☆☆

پروفیسر سید سراج الدین
سابق صدر شعبۂ انگریزی جامعہ عثمانیہ
وسابق صدر اقبال اکیڈیمی

مسجد قرطبہ

ایک تجزیاتی تحسین

مسجد قرطبہ کو سبھی نے ایک شاہکار اور اقبال کی عظیم ترین نظموں میں سے ایک مانا ہے۔ بلکہ تنقیدی شعور بتدریج اسے اقبال کی سب سے زیادہ بسیط پہلو دار اور فنی طور پر مکمل نظم ماننے پر مائل ہے۔ یہ بات بھی معلوم عام ہے کہ اس کا تعلق اقبال کے فکر وشعر اور وجدان کے عروج کے دور سے ہے۔ اس لحاظ سے مسجد قرطبہ شاعر کے فنی اور فکری سفر کے لئے ایک منزل کا مرتبہ رکھتی ہے۔ اقبال کی فکر کے اہم ترین رشتے ان کا تصور عشق وزماں، ان کے کردار، اور خون جگر کے اقدار اور فناء وبقا کے تصورات سارے اس نظم میں یکجا ہو گئے ہیں اور اس کے خمیر میں اس طرح پیوست ہیں کہ فکر وشعر ایک دوسرے کے ناقابل تجرید اجزاء بن گئے ہیں۔ خود اقبال بھی کم نظموں میں فکر وجدان، تصورات وواردات کے کیمیائی امتزاج کے اس نقطے پر پہنچے ہیں جو ''مسجد قرطبہ'' میں ملتا ہے۔

اقبال پر جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر ان کی فکر اور فلسفے سے دست وگریباں ہے اور ان کے شعری وفنی کمال سے بڑی حد تک گریزاں ہے۔ بھی اقبال کی بڑائی کا ایک پہلو ہے کہ ان کی وساطت سے اردو تنقید پختگی اور بلوغ کی منزلوں کی طرف بڑھ رہی ہے اور شاعر کے بارے میں بسیط ومبہم تعمیمات سے گزر کر باریک اور نپے تلے تجزیئے کی طرف آرہی ہے۔ چنانچہ عمیق حنفی صاحب کا مقالہ ''اقبال کی مسجد قرطبہ'' اس سمت میں ایک لائق تحسین اقدام ہے۔

میں نے عمیق حنفی صاحب کے مضمون کا اس مقالہ میں اس لئے زیادہ ذکر کیا ہے وہ اس مقالے کی تحریر کے وقت (۷۷ء میں) میرے پیش نظر تھا ورنہ ''مسجد قرطبہ'' پر متعدد تنقیدی

مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ خود اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے کوئی گیارہ مضامین یکجا کر کے اپنے ایک خاص شمارے میں شائع کر دیئے ہیں۔ ''مسجد قرطبہ'' ایک پیچ در پیچ نظم ہے اور اس پر کئی زاویوں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اسی بات کو لیجئے کہ اس نظم کے پس منظر میں مسلمانوں کی کئی برس کی ذہنی، تہذیبی اور تعمیراتی تاریخ غلطاں ہے اور اس کا جائزہ بجائے خود ایک عنوان ہے۔ لیکن یہاں میرا مقصود محدود ہے اور ان تحقیقی سمتوں سے اس کا تعلق نہیں۔ حنفی صاحب کے مقالے میں مسجد قرطبہ کا تاریخی اور فکری پس منظر مختصراً پیش ہو چکا ہے اور آخر میں انہوں نے اس نظم کی صوری اور صوتی ہیئت کے بارے میں بھی کچھ اشارے کئے ہیں۔ میں اس وقت صرف یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ مسجد قرطبہ کی نظم بحیثیت ایک جمالیاتی تجربے کے جو شاعر کا بھی ہے اور قاری کا بھی کون سے اجزا رکھتی ہے اور کس طرح ان کی تہذیب ہوئی ہے۔ لڑکپن سے یہ نظم میرے ذہن میں گھومتی رہی ہے اور یہ مختصر مقالہ ایک قرض ہے جسے میں نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے نظم کو ایک مستقل اکائی کی حیثیت سے دیکھا ہے جو شاعر کے ذہن سے تخلیق ہو کر ایک علیحدہ ذات ایک مطلق العنان وجود اختیار کر چکی ہے اور ہر اس قاری سے بطور خود مخاطب ہے جو اس کی آواز کی وسعتوں اور گہرائیوں میں ڈوبنے کے لئے آمادہ ہے۔ اسی لئے میں نے وقت عشق اور خون جگر وغیرہ کے تصورات کو صرف نظم کے چوکھٹے کے اندر دیکھا ہے جہاں وہ اشکال یا پیکروں کی طرح متحرک ہیں۔ نظم کی دنیا کے باہر ان کے جو رشتے ہیں اور جو عراقی، ابن خلدون، اپسی نوزا برگساں، ''کانٹ لائبنز رومی اور خود قرآن حکیم تک پہنچتے ہیں ان سے مجھے فی الحال سروکار نہیں۔ ویسے یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی جستجو ضروری اور نظم کی گہرائیوں کو سمجھنے کے لئے کارآمد ہے۔

کسی نظم کی تشکیل یا تو حرکیاتی ہوتی ہے یا انجمادی۔ حرکیاتی سے مراد یہ ہے کہ نظم ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف یا کسی سمت میں ایک عمودی یا پُر پیچ یا لہریاتی حرکت کی شکل رکھتی ہو۔ انجمادی سے مراد یہ ہے کہ نظم ایک منجمد کردہ خیال یا پیکر کے اطراف ایک طرح کا طواف کرتی ہو۔ اردو کی اکثر و بیشتر نظمیں انجمادی تشکیل کی حامل ہیں ان میں جو دھیمی حرکت ہے وہ ارتقائی یا عمودی نہیں بلکہ دائروی ہے۔ اس نظریئے کے تفصیلی جائزے کا یہاں موقع نہیں ہے لیکن اگر آپ مختلف نظموں کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو یہ بات کم و بیش واضح ہو جائے گی۔ مثلاً آپ ان

نظموں کو لیں جو برسات پر لکھی گئی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ برسات کو ایک مرکزی نقطۂ نظر بنا کر شاعروں نے اس کے اطراف اپنے بند یا اشعار اس طرح نظم کئے ہیں کہ ہر بند یا شعر اس مرکزی نقطے کی طرف رجوع کرتا ہے یا اس کے اطراف گھوم جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی بھی جو مثنوی سے ہٹ کر اردو کے کلاسکی دور میں نظم کا سب سے بڑا رسیا اور ماہر ہے اسی تکنیک سے کام لیتا ہے۔ نظیر کے آدمی نامے کو لیجئے اس میں آدمی کو بیچوں بیچ بٹھا دیا گیا ہے اور آپ شاعر کے ہمراہ اس کو مختلف بدلتے ہوئے زاویوں سے دیکھتے جاتے ہیں کہ آدمی یوں بھی ہے اور یوں بھی ان نظموں میں اگر کوئی حرکت ہے تو وہ گردشِ پرکار کی سی ہے۔ نظر کبھی مرکز سے ہٹنے نہیں پاتی۔ محیط چھوٹا یا بڑا ہو سکتا ہے لیکن آگے بڑھنے کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔ ایک لحاظ سے دیکھئے تو حالی کی مسدّس بھی جس کا محیط اس قدر وسیع ہے انجمادی ہیئت رکھتی ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ملت اسلامی کے پُر شکوہ ماضی کا منجمد پیکر ہے جس کے اطراف قاری کا ذہن گھومتا ہے۔

''مسجد قرطبہ'' کی تشکیل تحرکی ہے اور اس کا سفر زمانی و مکانی وسعتوں کو لپیٹا ہوا ایک نقطۂ اتصال سے گزرتا ہے۔ نظم کے آغاز ہی میں ایک رو ایک سلسلہ ہے۔ یہ زمانے کی رو ہے جو ازل سے بہتی آ رہی ہے اور ابد تک بہتی جائے گی۔ کرہ ارض کے دائرہ مکانی میں داخل ہو کر یہ رو تغیر و ارتقاء کا دھارا بن جاتی ہے جس کے زیر و بم سے حیات ارضی کی نباتی و حیوانی صورتیں اور تاریخ کے ادوار و حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ قرطبہ کی تہہ داری کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں کئی محالات یکجا ہیں یعنی بظاہر ایک طرح کی دوئی جو بہ باطن وحدت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرطبہ کا شعری محرک کئی سطحوں پر متوازی اور بہ یک وقت جاری ہے۔ ان محالات کے درمیان اس نظم کی طنابیں ایسی کھنچی ہوئی ہیں کہ کوئی جھول پیدا ہونے نہیں پاتا۔ یہاں یہ بات دہرانی پڑے گی کہ یہ کشیدہ طنابیں فن کے اعلیٰ نمونوں کی ایک بدیہی خصوصیت مانی گئی ہے اور یہ بھی عرض کرنا پڑے گا کہ اردو کی شاید ہی کوئی نظم ایسی ہو جو اس کسوٹی پر کسی جا سکے اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ فن کی اسی ایک شکل کو معتبر قرار دیا جائے۔ مشرقی شاعری میں جس چیز کو میں نے انجمادی تشکیل کہا ہے۔ زیادہ عام ہے اور اس کا اپنا ایک ٹھہرا ہوا حسن متمکن ہے۔ لیکن اقبال نے اسی ٹھہراو کے خلاف اپنی فکری اور شعری مہم چلائی تھی اور ان کی جدت اور مشرقی فکر اور اردو شعر و ادب پر ان کے حملہ ترکانہ کا ابھی تک تفصیلی جائزہ لیا جانا باقی ہے۔ اقبال کی دعوت حرکت ان کی نظموں کے معنوں ہی میں نہیں بلکہ ان نظموں کے تشکیل اجزاء

میں بھی پیوست ہے یعنی ساری نظم نہ صرف تحرک انگیز ہے بلکہ متحرک بھی۔

''قرطبہ'' کا سلسلۂ روز شب بیک وقت ساکن بھی ہے اور سیار بھی۔ دائم بھی ہے اور حادث بھی۔ اس کی حدیں ازل وابد میں غائب ہیں۔ ایک بُعدِ کائناتی کی حیثیت سے اس کی خصوصیت عصری نہیں بلکہ دوام یا ہمیشگی ہے، لیکن ساتھ ساتھ ایک ارضی بُعد اور انسانی قدر کی حیثیت سے اس میں روانی تغیر اور ارتقاء ہے۔ زمین کی نامیاتی فضاء میں داخل ہو کر زمانے کی ازلی رو سلسلہ روز وشب کا روپ دھار لیتی ہے ورنہ دن اور رات اس کے کائناتی ابعاد نہیں ہیں۔

تیرے شب وروز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

دن اور رات صفات کا تانا بانا ہیں، ذات سے ملحق نہیں لیکن ذات کا اثبات تو صفات ہی کے ذریعہ ممکن ہے اور وجود اور خودی کا اثبات بھی ممکنات کے زیر و بم کے بغیر ممکن نہیں۔ حوادث تاریخ اور ارتقا نامی اس حیثیت سے زمانِ ارضی کے مظاہر اور کارزار وجود کے عوامل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن زمانِ ارضی منزل ظہور ہی نہیں صیرفی کائنات بھی ہے۔ اسی کی زد سہہ کر یا اس سے ٹکر لے کر وجود اعتبار یا بے اعتباری سے دوچار ہوتا ہے۔ حدود ارضی میں وقت کا یہ سیلاب بظاہر ہر چیز کو بہا لے جاتا ہے ہر چیز آنی وفانی، بے ثبات، اول وآخر فنا، باطن وظاہر فنا، یہاں پہنچ کر ایک اور رو اس نظم میں ابھرتی ہے جو زمانے کے متوازی بھی ہے اور اس سے متصادم بھی۔ یہ ایک اور محال ہے بظاہر دوئی بہ باطن وحدت، یہ عشق کی رو ہے۔ عشق ہی دائم وحادث ہے اور مکانِ ارضی اس کی ہی منزل ظہور ہے۔ زمانے کی طرح یہ بھی سراپا دوام ہے۔ رفت وبود سے بے نیاز، اس کی حدیں ازل اور ابد، اس کے مقام انسان کا پیکرِ گل، خدا کا کلام اور خدا کا رسول، عشق دم جبریل کہہ کر اقبال نے اس کا سلسلہ لامکاں سے ملا دیا ہے۔ عمیق حنفی صاحب کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے کہ یہ عشق elanvital (تقاضائے نمو) کا بڑی حد تک ہم معنٰی ہے۔ اس کے اور بھی عناصر ہیں لیکن کم از کم قرطبہ کے اس دوسرے بند میں اس کا غالب عنصر یہی ہے دراصل غور سے دیکھئے تو قرطبہ کے پہلے دو بند زیادہ تر ایک کائناتی فضاء میں ملفوف ہیں اور اس نظم کا حرکیاتی سفر لامکان کی وسعتوں سے مکان کے حدود کی طرف چلتا ہے۔

زمانے اور عشق کے ان دو تیز دھاروں کے نقطۂ تصادم پر مسجد قرطبہ کا پیکر ابھرتا ہے۔ یہ

پیکر جمیل وقت کے دھارے کی زد پر ہے لیکن ''عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام''۔ اس تعمیر کا ٹھہراؤ اور سکون اس توازن کی سطح پر قائم ہے جو دو مساوی قوتوں کے نقطۂ تصادم پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے قرار کو دیکھ کر یکا یکی اس ٹکراؤ کی کائناتی طاقت کا اندازہ نہیں ہوتا جس پر اس کی بنیادیں استوار ہیں۔ اس نقطے پر سرکش و بے لگام قوت اپنی توانائی کو کھوئے بغیر ضبط اور نظم وتہذیب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی فن کا اعلیٰ ترین نقطہ ہے اور یہی زندگی کی معراج۔ زندگی اور فن دونوں صورتوں میں اس کا نتیجہ حسن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اس میں جمال، ضبط وتنظیم کا نتیجہ ہے۔ اور جمال اس بے روک کائناتی قوت کا عکس جس کی تہذیب سنگ وخشت یا حرف وصوت یا انسانی گوشت پوست میں کی گئی ہے۔

آپ قرطبہ کے دوسرے بند کو پڑھتے جائیں تو ''عشق'' کی تکرار مسلسل اور قوت بیان کی زد میں آکر آپ کی رگ وپے میں ایک سیلِ بے پناہ کا احساس قائم ہو جائے گا اور آپ اپنے کانوں میں ایک ایسے نغمے کی گونج سنیں گے جس کی لئے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ یہاں تک بڑھتے بڑھتے اس کی اڑتی ہوئی تان بند کے آخری شعر پر ٹوٹتی ہے۔

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسول ،عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم ، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِحیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات
اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود

نفسیاتی طور پر تیسرے بند کا پہلا مصرعہ دوسرے بند سے منسلک ہے جس عشق کی اس بند میں مسلسل تکرار ہے اسی کا رہین منت مسجد قرطبہ کا وجود ہے۔

اس مصرعہ کے ساتھ قرطبہ کی لئے دھیمی ہو جاتی ہے۔ ویسے زمین ہماری نظروں سے کبھی

اوجھل نہیں تھی اور وقت عشق کے ارضی ابعاد اپنی جھلک دکھلا تے رہے تھے۔لیکن میں نے جیسے پہلے کہا ہے ایک کائناتی فضاء طاری تھی۔ اب ہم انسانی دنیا کی مانوس فضاء میں داخل ہو گئے ہیں جہاں قرطبہ کی مسجد مکاں ولا مکاں کے نقطۂ اتصال پر ایک حسن ساکن کی طرح استادہ ہے لیکن اس سکون کے اندر بھی وہی عشق عالمگیر کی رو ہے جس کا ظہور دم جبرئیل۔ اور خدا کا رسول، اور خدا کا کلام میں ہے اس کے باوصف مسجد قرطبہ کم ازکم اپنی ہیئت ظاہر میں ایک انسانی تخلیق ہے اور اس کے جامد خشت وسنگ کی رگوں میں انسانی خون جگر کی گردش اور اس کا رنگ نمودار ہے۔ یہ خون جگر اس عشق کی ودیعت ہے جو خود ایک سیل ہے اور جس کی تقویم میں عصر رواں کے سواء اور زمانے بھی ہیں۔عمیق حنفی نے خون جگر کو لگن، خلوص اور وفا کے لفظوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے میرا خیال ہے کہ یہ الفاظ کمزور اور نا کافی ہیں۔خون جگر یہاں کاوش وکرب تخلیق کا مترادف ہے۔ اس کے بغیر کوئی نقش کمال و پائیداری نہیں پا سکتا۔تخلیق انسان کے قوائے ذہنی کا ارفع ترین عمل ہے اور اس کے کرب جاں فزاء سے وہی ذہن واقف ہیں جو اس صفت سے بہرہ ور ہوئے ہیں۔ حدودِ ارضی میں اقبال کو 'خون جگر' سے زیادہ اہم اور قیمتی کوئی اور ودیعت نظر نہیں آتی۔ مسجد قرطبہ کا آخری شعر اسی تان پر ختم ہوتا ہے۔

قرطبہ کا تیسرا بند مجھے مقابلتاً کمزور معلوم ہوتا ہے۔اس کے تحرک میں ایک طرح کا پس وپیش، ایک رک رک کر آگے بڑھنے کا احساس ہے جو پچھلے دو بندوں کے سیلاب بے پناہ کے مقابلے میں ایک جوئے کم آب کا سا منظر پیش کرتا ہے۔اعلیٰ سے اعلیٰ نظموں میں بھی ایسے مقامات جن کی حیثیت وقفے کی سی ہے ہمیشہ واقع ہوتے ہیں۔ یہاں اقبال پہلی دفعہ اپنی شخصیت کو بھی لے آتے ہیں جو اس مرحلے پر نظم کی تشکیل شان میں ایک مخل ہونے والی بات ہے اور یہیں پہلی بار وہ ایسی سہل عمومیتوں پر اتر آئے ہیں جیسے۔

عرش معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں

اس مقام پر قرطبہ میں ایک اور پیکر ابھرتا ہے اور نظم کی لئے پھر تیز ہونے لگتی ہے یہ پیکر اس مردِ خدا کا ہے جو مسجد قرطبہ کا خالق بھی اور کردار میں اس کا انسانی جواب بھی۔اسی کا خونِ جگر مسجد کی رگِ سنگ میں گرداں ہے اس کی ذات بھی ''قرطبہ'' کے دوسرے پیکروں کی طرح جامع المحالات ہے۔محدود لیکن بے حدود، جلیل اور جمیل ''خاکی ونوری نہاد، بندۂ مولا صفات'' شمشیر

بکف لیکن دلفریب و دلنواز، ''نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو''، یہ تضادات کی یکجائی اس کردار کی بے پناہ قوت یعنی اس کے جلال اور اس کی مہذب خوبصورتی یعنی اس کے جمال کی ضامن ہے۔ مسجد قرطبہ کی طرح اس کردار کا پیکر بھی ٹھہراؤ اور تموج کا نقطہ امتزاج ہے اور اس کے ابعاد بھی ایک طرف ارضی و انسانی ہیں تو دوسری طرف کائناتی اور لامکانی۔

اس کی زمین بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب ونیل

بند کے ختم پر قاری کا ذہن پھر زمانے کے اس دھارے کی طرف لحہ بھر کو منتقل ہوتا ہے جو ہر چیز کو اس طرح بہائے لئے جا رہا ہے کہ اس کی زد میں اور چیزوں کے علاوہ معجزہ ہائے ہنر بھی آنی فانی نظر آتے ہیں لیکن جس طرح اس فنائی لہر کے علی الرغم مسجد قرطبہ کا وجود نمودار ہوتا ہے اسی طرح مردِ خدا کا کردار ازل و ابد کے نقطۂ اتصال کی صورت میں ایک پیکرِ لازوال ایک مرکز دوام کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم وطلسم ومجاز

یہ پیکر عشق کی کائناتی قوت کے تعامل کا حاصل ہے اور منزلِ ارضی میں یہی گرمی محفل ہے۔ مردِ خدا کے اس مثالی و کائناتی پیکر سے گزر کر یہ نظم تاریخ انسانی کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہے اور چھٹے بند میں پہلی بار مسجد قرطبہ کے تاریخی مکان یعنی اندلس کا ذکر آتا ہے۔

تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

اور ذہن ان عربی شہسواروں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن کی نگاہوں نے تربیت شرق و غرب کی (یورپ کا نشاۃ ثانیہ ان ہی کا رہین منت ہے) اور جنہوں نے تاریخ میں پہلی دفعہ یہ بتایا کہ ''سلطنت اہل دل فقر ہے شاہی نہیں''۔ اب نظم کا دھارا تندی سے نرمیوں اور خوش خرامیوں کی طرف رواں ہے اور عربی سواروں کی ایک اور دین کا ذکر ملتا ہے جو خالص انسانی زندگی اور اس کی دلفریبوں سے متعلق ہے۔

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل وگرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

اس مقام پر پھر ایک بار قرطبہ کا رخ اس زمانے کی رو کی طرف ہو جاتا ہے جو پہلے بند میں ابھر کر مسلسل اس میں بہتی رہی ہے اور جس کے مقابل اسی قوت سے بہتی ہوئی وہ ابدی رو ہے جسے اقبال نے عشق کا نام دیا ہے۔ وقت یہاں اپنے ارضی بُعد یعنی مرورِ لمحات کی شکل میں نمودار ہے جو چیزوں کو گھس گھس کر انہیں نابود کر دیتا ہے۔ اے مسجد قرطبہ تو زمانے کی اس چیرہ دستی کے باوجود آج بھی قائم ہے اور ''دیدۂ انجم میں ہے تیری زمین آسماں'' لیکن ''آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں''

وقت نے کچھ زور ضرور چلایا ہے۔ اور اس سے انسانی دل دکھتا ہے مگر کہیں نہ کہیں کسی منزل کسی وادی میں عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں ضرور ہوگا جس کے آگے وقت لاچار ہے۔ ماضی وحال سے گزر کر یہ نظم مستقبل کی طرف لپکتی ہے اور تاریخ نگاہوں کے آگے لپٹی چلی آتی ہے۔ انقلاب زندگی کی سرشت ہے۔ فرانس والمانی واطالیہ اس سے گزر چکے ہیں یا گزر رہے ہیں اور روح مسلمان میں بھی وہی اضطراب ہے جس سے انقلاب جنم لیتے ہیں دیکھیں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

اب نظم کی تخیلی اور ذہنی شدت میں کمی ہو رہی ہے اور آخری بند کے آغاز ہی میں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ نغمہ اب اپنی تکمیل اور اختتام کی طرف رواں ہے مسجد قرطبہ وہ وادی جس کے دامن میں یہ مسجد سرافراز ہے۔ وادی میں بہتا ہوا دریا، خود شاعر اور وہ لمحہ جس میں یہ سب یکجا ہیں دھیرے سے ہمارے آگے مجسم نمودار ہوتے ہیں اسی یکجائی سے وہ قیامت خیز وجدانی تجربہ ابھرا تھا جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ نظم کی طرح ہمارا یہ وجدانی اور جمالیاتی سفر بھی اب ختم ہو رہا ہے۔ سورج ڈوب رہا ہے اور اک دہقانی لڑکی کا سادہ اور درد بھرا گیت شفق کی لہروں پر پھیل رہا ہے۔

وادی کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لئے سیل ہے عہد شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

وقت تو بہر حال ایک سلسلہ ہے۔ دختر دہقاں کا گیت ختم ہو جائے گا۔ سورج چھپ جائے گا اندھیرا پھیلنے لگے گا لیکن پھر صبح آئے گی اور سلسلۂ روز و شب چلتا رہے گا تغیر و ارتقاء جاری رہے گا۔

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

وادی الکبیر کے کنارے استادہ شاعر کی نظر سرِ شام عالم نو کی سحر دیکھ رہی ہے۔ پھر ایک بار وقت کا دھارا بہہ رہا ہے۔ انسانی تاریخ کے صفحے الٹ رہے ہیں۔ امتوں کی روح کشمکشِ انقلاب ہے لیکن یہ بھی سن لو کہ اس داستان میں رنگ خونِ جگر سے ہے۔ وقت کی دستبرد کا جواب بھی وہی نقش ہے جس میں خون جگر کی آمیزش ہے جیسے یہ مسجد قرطبہ۔ پڑھنے والے کو آخری شعر پر پہنچ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کا طویل ہنگامہ خیز تخیلی سفر، مسجد قرطبہ کے صحن میں آ کر رک گیا ہے جو ایک نقطہ بھی ہے اور ایک داستان بھی جامد بھی ہے اور حرکت در آغوش بھی، نقش کی طرح نغمہ بھی خون جگر کے بغیر ''سودائے خام'' ہے۔ مسجد قرطبہ بحیثیت ایک تعمیر کے اور ''مسجد قرطبہ'' بحیثیت ایک نظم کے یہ دونوں خون جگر کی ودیعت ہیں لہٰذا دونوں میں رنگِ ثباتِ دوام ہے۔

مسجد قرطبہ کی ذہنی و جمالیاتی حرکت عمومیت سے تخصیص پھر خصوصیت سے تعمیم کی طرف ہے۔ اس سے گزرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے کہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت نور کی کرنیں جو فضاء میں منتشر اور سارے جہاں میں پھیلی ہوئی تھیں مرتکز ہونے لگتی ہیں، یہاں تک کہ یہ نقطۂ ارتکاز نور کی شدت کے سبب فضاء کے دھندلکے میں ایک شرارے کی طرح چمکنے لگتا ہے اور نظریں خیرہ ہونے لگتی ہیں لیکن یہ نقطہ بجائے خود ایک منشور بھی ہے جس پر مرتکز ہو کر نور کی شعاعیں رنگوں میں پھوٹ پڑتی ہیں اور پھیلنے لگتی ہیں اور وہی نور جو کچھ عرصہ پہلے ارتکاز کی منزلوں سے گزر رہا تھا اب انعطاف کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے اور ساری نظم انتشار و ارتکاز و انعطاف کا ایک نورانی ہیولا بن کر ابھرتی ہے جو اپنا ایک ٹھہرا ہوا پیکر بھی رکھتی ہے اور اپنے اندر تحرک و ارتقاء کا ایک ہنگامہ بھی لئے ہوئے ہے۔

☆☆☆

خبرنامہ

اقبال اکیڈیمی کے اجتماعات

۱۔ ۹رنومبر ۲۰۰۹ء "محفل اقبالؔ" بموقع یوم ولادت علامہ اقبالؔ

مقررین	موضوعات
۱۔ جناب محمد ظہیر الدین صدر اقبالؔ اکیڈیمی	"مطالعہ اقبالؔ کے مختلف رویے"
۲۔ جناب مضطر مجاز	"اقبالؔ اور عالم اسلام"
۳۔ جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبالؔ اکیڈیمی	کلام اقبالؔ

صدارت: پروفیسر یوسف کمال

نظامت: جناب محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی

۲۔ ۳۰ردسمبر ۲۰۰۸ء۔ محفل اقبال

مقررین	موضوعات
۱۔ پروفیسر عبدالحق سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی	اقبالؔ کا تصور حرکت و عمل
۲۔ ڈاکٹر سید عبدالباری مدیر ماہنامہ ملی اتحاد و پیش رفت	اقبالؔ اور استعمار
۳۔ جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبالؔ اکیڈیمی	کلام اقبالؔ

مہمان خصوصی

جناب رحیم الدین انصاری صدر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

صدارت: جناب محمد ظہیر الدین، صدر اقبال اکیڈیمی

نظامت: جناب محمد ضیاء الدین نیر

۳۔تقریب رسم اجراء ۷/مارچ ۲۰۰۹ء

''اقبال۔نئی تشکیل'' مصنف پروفیسر عزیز احمد

بمقام لکچر ہال اقبال اکیڈیمی، حیدرآباد

صدارت: جناب محمد ظہیر الدین، صدر اقبال اکیڈیمی

مہمان خصوصی۔ جناب محمد رحیم الدین انصاری، صدر نشین اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

اظہار خیال: پروفیسر یوسف کمال، پروفیسر تقی علی مرزا

کلام اقبال: جناب سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی

نظامت: جناب محمد ضیاء الدین نیر، نائب صدر اقبال اکیڈیمی

اسلامک ہریٹیج فاؤنڈیشن کے اجتماعات

۱۔۲۳/نومبر ۲۰۰۸ء

توسیعی تقریر ''ڈاکٹر ریاض الدین ریاض (امریکہ) ماہر نفسیات

موضوع: نفسیاتی علاج میں تصوف اور تزکیہ کے اصول''

صدارت: ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش

تعارف: جناب محمد عمر علی خان صاحب کارگذار صدر فاؤنڈیشن

۲۔ ۸/فروری ۲۰۰۹ء

رسم اجراء ''مسلم سائنسداں''

(مرتبین ایم اے صدیقی و فائزہ صدیقی)

اجرائی بدست: مہمان خصوصی جناب رحیم الدین انصاری صدر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

اظہار خیال: ۱۔مولانا خواجہ محمد شریف شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ

۲۔پروفیسر یوسف کمال

۳۔ڈاکٹر احمد کمال

۴۔جناب محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈیمی

۵۔جناب محمد عمر علی خان کارگذار صدر فاؤنڈیشن

صدارت: پروفیسر ایم ایم تقی خان نظامت جناب محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی

مطبوعات:

۱۔ ''اقبال۔نئی تشکیل''۔ازعزیز احمد

علامہ اقبالؔ کی وفات کے بعد ابتدائی دس سال کے عرصہ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ نہایت اونچے درجے کی ہیں اوران کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ پروفیسر عزیز احمد کی کتاب ''اقبالؔ۔نئی تشکیل'' بھی ان ہی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب کمیاب ہوگئی تھی۔ ''اقبالؔ۔نئی تشکیل'' کو اقبال اکیڈیمی حیدرآباد نے نہایت دیدہ زیب طباعت کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے جس کا رسم اجراء صدر اردو اکیڈیمی آندھراپردیش جناب رحیم الدین انصاری نے ۷/مارچ ۲۰۰۹ء اقبالؔ اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ خصوصی تقریب میں انجام دیا۔

۲۔ مسلم سائنسداں۔مرتبین: ایم اے صدیقی وفائزہ صدیقہ

اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اردو اور انگریزی میں علحدہ علحدہ مسلم سائنسدانوں کے سوانحی خاکوں پر مشتمل کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ مسلم نوجوانوں اورنونہالوں کے معلومات میں اضافہ کے لئے یہ ایک نہایت مفید کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی عہد کے ۲۲ مسلم سائنسدانوں اوران کے کارناموں کا مختصراً تذکرہ ہے۔ دیدہ زیب ملٹی کلر سرورق کے ساتھ سائنسدانوں کی رنگین تصاویر بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ خصوصاً طلباء وطالبات کے لئے معلوماتی ہے۔

کتب خانہ:

الحمدللہ کتب خانہ میں اضافہ کا سلسلہ جاری ہے۔ پچھلے چھ ماہ کے عرصہ میں کتب خانہ کے لئے مختلف اداروں اور ہمدردوں کی جانب سے جملہ (۶۹) گرانقدر کتابیں وصول ہوئی۔ جن کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال اکادمی پاکستان (۲۴)۔۲۔ خانہ فرہنگ ایران، ممبئی (۳۶)۔۳۔ مرکز تحقیقات فارسی مجلّہ (۱)۔۴۔ پروفیسر انور معظم۔ وضاحتی اردو وکتابیات (۴ جلدیں) ۵۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری (علی گڑھ) ۶۔ محترمہ تسکینہ فاضل (سری نگر) (۲)۔۷۔ پروفیسر اخلاق اثر (بھوپال) (۱)۔۸۔ جناب رشید انصاری (حیدرآباد) (۱)۔ ۹۔ سید شاہ غازی الدین

(شولاپور۔ مہاراشٹرا) (۲)۔ وغیرہ، اکیڈیمی ان اداروں اور معاونین کی ممنون ہے۔ اس کے علاوہ دارالمطالعہ کے لئے رسائل بھی وصول ہورہے ہیں۔

کتب خانہ کے کام کی نگرانی اور اندراج جناب سید محمود قادری نہایت دلچسپی اور حسن وخوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ جناب محمد عمر کتابوں کی حفاظت اور ترتیب کا کام انہماک سے کررہے ہیں۔

دارالمطالعہ میں آنے والے اخبارات اور رسائل کے مطالعہ کے علاوہ' ریسرچ اسکالرس مختلف موضوعات پر کتب خانہ سے استفادہ کررہے ہیں۔

☆☆☆

Vol: 18 Issue : 1
April 2009

ISBN: 81-86370-43-9
Ph: 66663950

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

April 2009

"IQBAL REVIEW"

IQBAL ACADEMY
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank,Hyderabad-28, A.P., INDIA